اُردو طنز و مزاح پر مبنی دوماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری، فروری ۲۰۱۹ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جنوری، فروری ۲۰۱۹ء

شمارہ نمبر ۱۹

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہدؔ

روبینہ شاہین

محمد امین

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا کیا کہاں

سفر وسیلۂ ظفر

مزاحیے

نظمالوجی

غیر کتابی چہرے

ادب و دب

اِس کے علاوہ مختلف صفحات پر اظہر سعید مجوکہ، انور مسعود، ڈاکٹر عزیز فیصل، ڈاکٹر محمد یونس بٹ، ممتاز مفتی، کائنات بشیر، امجد اسلام امجد وغیرہ کے چلبلے اور برجستہ چٹکلوں اور ادارے کے تشخیص کردہ بہت سے قہقہہ آور کارٹون۔

مشتری ہوشیار باش

ارمغانِ ابتسام کے گزشتہ شمارے archive.org کے ذیل کے ربط پر دستیاب ہیں:

https://archive.org/details/@nzkiani

قلمکار شاعر ہو یا ادیب، معاشرے کا ڈاکٹر ہوتا ہے اور ان میں مزاح نگار فزیوتھراپسٹ ہوتا ہے جبکہ طنز نگار سرجن جو اپنی سرجری سے ہمیں ہماری وہ شکل دکھاتا ہے جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ نوجوان قلم کار ہے جس نے حال میں ہی لکھنا شروع کیا ہے یعنی اگر ایک سو سالہ بابا بھی ملک الموت کا انتظار موقوف کر کے قبر میں لٹکے ہوئے پاؤں باہر نکال کر لکھنا شروع کر دے تو وہ نوجوان قلمکار ہی کہلائے گا بشرطیکہ اس کی تحریریں جوان ہوں۔

نوجوان قلمکار بے شمار مسائل کا شکار ہے، جس میں سب سے بنیادی مسئلہ صحت مند ماحول کی فراہمی ہے جو گھر کے باہر ہی نہیں گھر کے اندر بھی محال ہے کیونکہ والدین اور خاندان کی نظر میں قلمکار بننے سے بہتر ہے کہ ان کا بچہ چاول چھولے کی ریڑھی لگا لے یا دکان پہ بیٹھ کر ملاوٹ اور بے ایمانی میں ان کا ہاتھ بٹائے۔ یہ نہ کرنے کی وجہ سے عموماً قلمکار مالی مسائل کا شکار ہی رہتا ہے کیونکہ یتیموں کی طرح ادب کی سرپرستی بھی کم ہی لوگ کرتے ہیں اور معاوضہ دینے والے رسائل تو آٹے میں نمک اور ملک میں دیانت داری کے برابر ہیں اور یہ معاوضہ بھی عموماً اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یار لوگ ادب چھوڑ کر بے ادبیاں شروع کر دیتے ہیں۔

نئے قلمکار کے لئے موضوع کی تلاش کسی آئیڈیل رشتے کی تلاش سے کم نہیں، کیونکہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھانا چاہتا ہے اسے بتایا جاتا ہے کہ اس پر تو پطرس بخاری صاحب یا منٹو پہلے ہی طبع آزمائی کر چکے ہیں یا اس مضمون کو شاعری میں غالب اور جگر پہلے ہی باندھ چکے ہیں تو نوجوان قلمکار کو افسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنی دیر سے کیوں پیدا ہوا۔ ایک نوجوان شاعر یا ادیب اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر شہرت حاصل کرنے کا غلط طریقہ یعنی محنت استعمال کرتا ہے تو پھر اس کا حشر بھی وہی ہوتا ہے جو محنتی لوگوں کا ہوتا ہے۔ جب کوئی ادیب معاشرے سے کوئی کہانی یا ناول کشید کرتا ہے یا کوئی نیا شاعر بدہضمی یا سینڈلوں کی مار کے سبب کوئی غزل اگل بیٹھتا ہے تو اسے اس وقت تک نیند نہیں آتی، جب تک وہ اسے کسی رسالے کو بھیج نہ دے لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ مدیر صاحبان اسے بیمار تحریروں کے سینیٹوریم یعنی ردی کی ٹوکری کی سیر کرا دیتے ہیں کیونکہ بعض رسالوں کا معیار اتنا اونچا ہوتا ہے کہ وہاں تک تحریر بغیر جیٹ انجن کے پہنچ نہیں سکتی۔ بعض اوقات اچھی اچھی تحریریں پالیسی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ پالیسی کا نزلہ بھی عموماً نئے قلمکاروں پر ہی گرتا ہے، معروف قلمکار اس پالیسی سے ایسے مستثنیٰ ہوتے ہیں جس طرح ممبران اسمبلی قانون سے۔ نئے قلمکاروں کی تحریروں کو عموماً شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے کہ اتنی اچھی تحریر اس نے کیسے لکھ لی، جبکہ بعض اوقات نقال بھی تعلقات کی بنا پہ شائع ہو جاتے ہیں، اس لئے بعض لوگ انتقالی ادب لکھنا شروع کر دیتے ہیں جس کو پڑھ کر بندہ سر پیٹتا ہے تو کبھی بال نوچتا ہے اور اگر نوجوان قلمکار اپنی کتاب یا مجموعہ چھپوانے کی کوشش کرتے ہیں تو پبلشر ان کی کھال اتار لیتے ہیں۔ کئی مشہور قلمکاروں نے اسی لئے لکھنے کا آغاز خواتین کے ناموں سے کیا۔

خادم حسین مجاہد

پرانے چاول

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع وفرمانبردار، اپنی بیوی روشن آراء کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات وخصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اُتنے ہی روشن آراء کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انہیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لئے باعث ذلت سمجھتی ہیں۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں، جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جاسکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجئے، اچھے خاصے اور بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل وصورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جواء وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں، ان ہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہوجائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے وہ ہمارے گھر میں "موئے کبوترباز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آراء کو فوراً خیال ہوجاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوترباز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہوجاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی

بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا، تو میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا، آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے ''اندر آجاؤ۔''

ہم نے کہا ''نہیں آتے تم باہر آؤ۔''

خیر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لئے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے ''بیٹھ جاؤ۔''

ہم نے کہا ''بیٹھیں گے نہیں۔''

آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے، مرزا بولے ''کیوں بھئی؟ خیر باشد؟''

میں نے کہا ''کچھ نہیں۔''

کہنے لگے ''اس وقت کیسے آنا ہوا؟''

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو، پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا اس لئے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں، آخر ہم نے کہا ''مرزا، بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔

اس دن تو ہم یوں ہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہوگئی۔ ہم نے کہا ''چلو، اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہوگئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لئے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ

ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عاداتِ قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے، سردی کا موسم ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ ''توری چھل بل ہے نیاری۔۔۔''

اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا، اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کردینے کی قسم کھالی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آراء نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، روشن آراء صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کرسکا۔ کہنے لگی "تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟"

میں نے کہا "اور کیا؟"

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہوگئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں، بیشک ادودھم مچائیں، میں بیشک گاؤں، بیشک جب چاہوں اُٹھوں، بیشک تھیٹر جاؤں۔

میں نے کہا "روشن آراء جلدی کرو، نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کراچکا تو کہنے لگی "خط روز لکھتے رہیے!"

میں نے کہا "ہر روز اور تم بھی!"

"کھانا وقت پہ کھالیا کیجئے اور ہاں ڈھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا، تہہ کرکے جیب ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں، دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں، جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا، آزادی کے لہجہ میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہوگیا۔ سگریٹ سلگالیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہوگیا۔

رستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا، تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا، باہر ہی سے نوکر کو آواز دی "امجد!"

"حضور!"

"دیکھو، حجام کو جاکے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

کسی بھی معاشرے میں حدود وقیود کے بغیر آزادی کا تصور خاصا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ مرغ بھی جب تک اپنی چاردیواری اور ڈربے میں بندرہے کم نقصان دہ ثابت ہوتا ہے لیکن جب اسے مکمل طور پر آزادی مل جائے تو نقص امن کا باعث بھی بنتا ہے۔ جب وہ دوسروں کی دیواریں پھلانگنا شروع کردے یا ہمسائے کی مرغی کو تنگ کرنا شروع کردے تو اس سے مرغ کے ساتھ ساتھ ہمسائے کے کردار پر بھی حرف آسکتا ہے۔ سمجھیں امن کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے کیونکہ ایسے میں اکثر جھگڑوں کے درمیان وجہ تنازعہ مرغا ہی ہوتا ہے۔ اور نوبت تو تکرار سے مارکٹائی تک پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرغ کا مالک صرف مرغ ہی نہیں پالتا بہت سی مشکلات بھی پال لیتا ہے۔ جو مرغ کی ذرا سی غفلت سے اس کے لئے کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہیں۔

شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ

''بہت اچھا۔''

''گیارہ بجے سن لی نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔''

''بہت اچھا حضور۔''

''اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے، تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔''

یہاں سے کلب پہنچے، آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا، اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام ونشان تک نہیں سب کمرے دیکھ ڈالیے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی، شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی، صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔ اس سے پوچھا ''کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟''

کہنے لگا ''حضور آپ جانتے ہیں، اس وقت بھلا کون آتا ہے؟''

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا معلوم ہوا ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے، دفتر پہنچا دیکھ کر بہت حیران ہوئے، میں نے سب حال بیان کیا کہنے لگے۔ ''تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو، تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں، شام کا پروگرام کیا ہے؟''

میں نے کہا ''تھیٹر!''

کہنے لگے ''بس بہت ٹھیک ہے، تم باہر بیٹھو میں ابھی آیا۔''

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی، اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا، پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالیا اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پہ جمائی۔

جمائی پہ جمائی۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔

پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔

بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا ''ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا، مردود کہیں کا، سارا

سیلفیاں

سیلفیوں کے دور میں اچھی نہیں ہیں غفلتیں
جیسا سوشل میڈیا کہتا ہے ویسے ہی جئیں
جیسی بھی حالت میں ہیں
اور جہاں پر بھی ملیں
سلیفیاں لینے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں

نوید ظفر کیانی

دن میرا ضائع کردیا۔"

وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا۔ اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے، رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے، تکیے پر سر رکھا ہی تھا، کہ نیند نے بیہوش کردیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ۔"

یہ عیش مدت بعد نصیب ہوا، کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں، اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لئے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی، جس کی امید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال۔ دل میں آیا، وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو دیکھتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر آیا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا دل بھر آیا، گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہوگیا۔ اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بیقرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا، باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اداس ہوں، تم فوراً آجاؤ!

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا، یقین تھا کہ روشن آراء اب جس قدر جلد ہوسکے گا، آجائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں اس لئے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔

سائنس کی معاونت سے اب تو ہر مشاعرہ ویڈیو اور آڈیو کیسٹ پر محفوظ ہو رہا ہے۔ سائنس نہ صرف ادب وشعر کی معاون ہو رہی ہے بلکہ مذہبی عقائد کی صداقت کے ثبوت بھی فراہم کرتی جارہی ہے۔ اب بھی اگر کوئی شخص روزِ حشر وصول ہونے والی، فرشتوں کی تیار کردہ، اُس کیسٹ کا منکر ہے جسے نامۂ اعمال کہا گیا ہے تو اسے تمغۂ جہالت کے سوا اور کیا ایوارڈ دیا جاسکتا ہے؟

بات سے بات از انور مسعود

ہمارا مکان تو خالی تھا ہی، سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے قواعد وضوابط کے مطابق اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد کچھ خوش طبعی شروع ہوئی، یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کردیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اُڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اُڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے کوئی فرش پر بازو ٹیکے بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا، ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کردیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جاتا ہے۔ وہ چور۔ سب نے کہا "واہ واہ کیا بات کہی ہے۔"

ایک بولا "پھر آج جو چور بنا، اس کی شامت آجائے گی۔"

دوسرے نے کہا "اور نہیں تو کیا، بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل

ہے۔سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے!''

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے'' ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے۔''

کوئی کہے''نہیں حضور، سب کے پاؤں پڑے، اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔''

دوسرے نے کہا''نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔''

آخر میں بادشاہ سلامت بولے''ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ اور یہ اس حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔''

سب نے کہا'' کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔کیا سزا تجویز کی ہے! واہ واہ!''

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے، ہم نے کہا'' تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آجائے گی۔''

نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی، ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن پر پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی، منہ سے برقعہ الٹا تو روشن آراء!

دم خشک ہوگیا، بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا، زبان بند ہوگئی، سامنے وہ روشن آراء جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ تم فوراً آجاؤ میں بہت اداس ہوں اور اپنی یہ حالت کو منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں، اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہوگئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آراء کچھ دیر تک چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی۔۔۔لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے، کہ میں بذات خود تو ازحد شریف واقع ہوا ہوں، جہاں تک میں، میں ہوں مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کرسکتی، میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے، اس لئے میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا، سوائے ڈاکیے یا حجام کے۔۔۔اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کروں گا۔

''خط ہے؟''

''جی ہاں۔''

''دے جاؤ، چلے جاؤ۔''

''ناخن تراش دو۔''

''بھاگ جاؤ۔''

بس، اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا، آپ دیکھئے تو سہی!

سید احمد شاہ المعروف پطرس بخاری (یکم اکتوبر ۱۸۹۸ء تا ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء) ہمہ پہلو شخصیت کے حامل تھے، وہ اُردو کے مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک استاد، براڈ کاسٹر، ڈپلومیٹ اور منجھے ہوئے نثر نگار بھی تھے۔پطرس بخاری گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی ادب کے استاد رہے جہاں آپ کے شاگردوں میں فیض احمد فیض اور ن۔م۔راشد جیسے معروف شعراء شامل رہے ہیں۔وہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء تک وہ وہاں کے پرنسپل کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔پاکستان بننے کے بعد اُنہیں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل (تا بہ مرگ) مندوب ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ چند مضامین پر مشتمل ''پطرس کے مضامین'' اُن کی واحد کتاب ہے جو ضخامت میں خاصی مختصر ہونے کے باوجود آج بھی اُردو طنز و مزاح میں منفرد مقام کی حامل ہے۔

ایک تھا بادشاہ

کرنل (ر) مسعود شیخ / عزیز نے سن

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسی کرۂ ارض پر ایک ایسا ملک آباد تھا جہاں باتیں بہت زیادہ ہوتی تھیں اور کام بہت کم۔ پرانے زمانے میں جس طرح باقی سب ملکوں میں ایک ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا، اس ملک میں بھی ایک بادشاہ حکمران تھا۔ رعایا کو بادشاہ ایک آنکھ نہ بھاتا۔ رعایا تو خود رعایا، بادشاہ کے محل والوں کو بھی اس سے سخت نفرت تھی۔ سچ پوچھیے تو بادشاہ سلامت تھے ہی اس قابل کہ لوگ ان سے نفرت کرتے۔

عوام کو بادشاہ سے جس قدر نفرت تھی، ولی عہد سے اتنی ہی محبت تھی۔ وہ پوری سلطنت کی قدر و منزلت اور چاہت کا واحد حقدار تھا۔ چھوٹے بڑے، مرد عورت سب ولی عہد کو بے حد چاہتے۔ اس کا اشارہ پاتے ہی ہر شخص اس کی خاطر جان قربان کرنے کو تیار ہو جاتا۔

محبت کا یہ جذبہ یک طرفہ نہیں تھا۔ ولی عہد کو بھی وطن اور عوام سے بہت پیار تھا۔ وہ جب کبھی بادشاہ سلامت کی کڑی نگرانی سے بچ کر سیر سپاٹے کے بہانے محل سے باہر نکلتا ملک کے اجاڑ بیابان علاقے اور خشک اور ویران زمینیں دیکھ کر خون کے آنسو بہاتا۔ اکثر اسے بلند آواز میں کہتے سنا گیا ”آہ میرے پیارے وطن کیا تیری

یہ زمین ہمیشہ یوں ہی ویران پڑی رہے گی؟"

کبھی اس کا گزر کسی دلدل بھرے علاقے سے ہوتا تو کہتا "اگر کسی طرح اس دلدل کے علاقے کے پانی کا رخ بنجر زمینوں کی طرف موڑ دیا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ ایک طرف سوکھی پیاسی زمینیں سرسبز اور شاداب ہو جائیں تو دوسری طرف یہ دلدل بھرا علاقہ آباد ہو جائے۔ اس طرح بیماری سے بھی نجات مل جائے اور بھوک ننگ سے بھی۔"

ملک کے اخبار نویسوں اور صحافیوں کو ولی عہد سے خاص اُنس تھا۔ خود ولی عہد بھی رعایا کے تمام طبقوں میں سب سے زیادہ صحافیوں کو چاہتا تھا۔ جب کبھی اسے بادشاہ سلامت کی طرف سے اخبارات ورسائل پر ڈالے جانے والے ناجائز دباؤ کا احساس ہوتا وہ سخت پریشان ہو کر کہتا "جس ملک میں پریس آزاد نہیں، وہاں جمہوریت کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔"

ولی عہد کو جب موقع ملتا، صحافیوں سے خفیہ پریس کانفرنس کرتا۔ ان کے مسائل نہایت غور سے سنتا۔ ان کی مشکلات پر پریشانی کا اظہار کرتا۔

اِدھر صحافی بھی ولی عہد کے اردگرد اِس امید سے جمع رہتے کہ شاید وہ کسی روز بادشاہ کا تختہ الٹ دے اور اس کی جگہ خود تخت پر بیٹھ جائے تو پریس کو مکمل آزادی نصیب ہو جائے۔

بعض اوقات ولی عہد صحافیوں کو بڑی بڑی ضیافتیں کھلاتا۔ ان کے ساتھ تصویریں کھنچواتا۔ کبھی کبھی ان تصویروں کی پشت پر یہ عبارت لکھ اخبار نویسوں کو دیتا۔ "دوستی کے بہترین دنوں کی یادگار۔" اس عبارت کے نیچے اپنے پُر خلوص دستخط بھی ثبت کر دیتا۔

آزادی تقریر وتحریر کے حامی ولی عہد سے ملک کے فنکاروں کو بھی بڑا لگاؤ تھا۔ ولی عہد کے قدر دانوں میں کم آمدنی والے سرکاری ملازم اور محنت کش طبقے کے لوگ بھی شامل تھے۔ انہیں مکمل یقین تھا کہ اگر ولی عہد تخت نشین ہوا تو ان کے تنگی کے دن بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ کاشتکار بھی ولی عہد کے بہی خواہ تھے۔ ہر شخص اس امید پر زندہ تھا کہ وہ بادشاہ بنے گا تو ملک کو جنت نشان بنا دے گا۔

بادشاہ کو ولی عہد کے اس قدر ہر دلعزیز ہونے کا احساس ہوا تو اس نے اس بیچارے پر ظلم وستم ڈھانا شروع کر دیا۔ عوام سے ملنے اور بات چیت کرنے پر پابندی لگا دی۔ کچھ عرصہ بعد محل کے ایک کمرے میں اسے نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ہیرے جواہرات، نوجوان خوب صورت لونڈیاں اور اسی قسم کے دوسرے لالچ دے کر اس کا منہ بند کرنے کی کوششیں کیں لیکن ولی عہد کے دل میں رعایا اور وطن کے بہبود کی ایسی دھن سما چکی تھی کہ اس نے ان چیزوں کی

ایک افسر کا مسئلہ

بہت دشوار ہے استاد جی پر
مرا اب کرنا صادر، کوئی آرڈر
کریں واپس ہمیشہ
مرا ہر حکم نامہ
درست کر کے مری انگلش گرامر

نوید ظفر کیانی

اسکول میں ماسٹروں سے مرعوب ہونا ہمارے نزدیک ہمیشہ ذلت کی بات تھی، البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر کے گھنٹے میں تھوڑی دیر کے لیے دم سادھے بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے گویا ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی شادی کر لی ہے۔ کیا مجال ہے کہ بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے بھی کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ صبح دیر سے سو کر اٹھیں تو منحوس، منہ ہاتھ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو اچھوت، دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور نوالہ حاضر۔۔۔ جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل سے ٹالنا چاہیں تو الیونی، تاش کھیلیں تو جواری، شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے ذمہ دار، باہر گھومنے جائیں تو آوارہ، رات کو دیر سے گھر آئیں تو اعلیٰ درجے کے بدمعاش، پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو لوفر اور اگر کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر اونگھیں یا منہ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بیوقوف۔۔۔

اب آپ ہی بتائیں یہ زندگی ایک شوہر کی زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے کسی مجرم کی زندگی، مگر جیسی بھی زندگی ہے بہر حال اب اسی طرح اس کو بسر کرنا ہے، اس لیے کہ بیگم صاحبہ کا ساتھ کوئی ایک دو دن کا نہیں زندگی بھر کا ساتھ ہے اور زندگی ایک بڑی مدت کا نام ہے کہ اس کا تصور کرتے ہوئے بھی اختلاج ہونے لگتا ہے۔ خبطی از شوکت تھانوی

طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اسے نہ اپنی جان کی پروا تھی اور نہ عیش و عشرت یا آرام طلبی کی۔

شاہی محل کا تمام سٹاف اور بادشاہ کے وزراء بھی ولی عہد سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ اس کے خفیہ طور پر لکھے ہوئے مکتوب چوری چوری اخبار نویسوں تک پہنچاتے۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب رعایا نے بادشاہ کے ظلم و ستم کی تاب نہ لاتے ہوئے ملک کے روشن خیال طبقے کی رہنمائی میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ بادشاہ کو تخت سے اتار کر ولی عہد کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

عوام نے خوشیوں کے شادیانے بجائے اور شاہی محل کے اراکین نئے بادشاہ کو اس عظیم الشان کامیابی پر مبارکباد دینے گئے۔ نئے بادشاہ نے ان سب کو بہت غور سے دیکھا اور پھر حیرت بھری آواز میں پوچھا ''آپ کون ہیں؟''

وہ بڑے حیران ہوئے اور حیران کیوں نہ ہوتے؟ جس شخص کو بادشاہ بنانے کے لئے انہوں نے سالہا سال سنگین خطرات مول لئے اور اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہوئے بغاوت کر کے اس کے لئے تخت و تاج خالی کروایا وہی شخص اب انہیں پہچاننے سے انکار کر رہا تھا۔

آخر ایک شخص نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا ''بادشاہ سلامت میں وہی ناچیز خادم ہوں جو شاہی محل میں آپ کی نظر بندی کے دوران اپنی قیمتی جان ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے خفیہ مراسلات اخبارات کو پہنچاتا تھا۔''

بادشاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے بولا ''یہ کب کی بات ہے؟ مجھے تو کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آتا۔ میں نے تو تمہیں آج زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔''

ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر عرض کی ''عالی جناب، آپ مجھے تو ضرور پہچان لیں گے۔ میں وہی شخص ہوں جو راتوں کو چوری چوری آ کر آپ کو پرانے بادشاہ کے تخت کو پلٹنے کی مختلف اسکیمیں پیش کیا کرتا تھا۔ ان اسکیموں پر عمل درآمد کرانے کا شرف بھی مجھ کو حاصل ہوا۔''

بادشاہ نے بے رخی سے جواب دیا ''تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ مجھے ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔''

ان لوگوں نے لاکھ کوشش کی مگر بادشاہ کسی کو پہچان نہ سکا۔

اگلے روز ایک وفد بادشاہ کو مبارک باد دینے آیا۔ بادشاہ نے سب کو باری باری سر سے پاؤں تک بغور دیکھا پھر بولا ''میں آپ حضرات میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا۔ میرے خیال میں اس سے پہلے آپ لوگوں سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

ایک اخبار نویس نے بادشاہ سے کہا ''عزت مآب، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ مجھے بھی نہیں پہچانتے جسے آپ نہایت بے تکلفی سے ''میرے بھائی'' کہا کرتے تھے۔ جب ملاقات ہوتی میرے گلے لگ کر بوسا دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر آپ مجھے مل کر ہائے آزادی۔ ہائے آزادی پکار پکار کر آنسو بہاتے تھے۔''

''کون، میں آنسو بہایا کرتا تھا؟''

''جی حضور آپ۔''

''لیکن کب؟''

''اکثر۔ بادشاہ بننے سے صرف چند روز پہلے تک۔''

''لیکن کہاں؟''

”جہاں کہیں ملاقات ہوتی۔ ہر جگہ۔“
”آپ ضرور دھوکہ کھا رہے ہیں۔“ بادشاہ نے بڑے اعتماد سے کہا ”مجھے اس بات کا علم نہیں۔ آپ نے میری ہی شکل کا کوئی اور آدمی دیکھا ہوگا۔“
اخبار نویس نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور بادشاہ کو دکھائی۔ یہ تصویر دونوں نے اکٹھے کھنچوائی تھی۔ تصویر پر بادشاہ کے ان دنوں کے آٹو گراف تھے جب وہ ولی عہد تھا۔ ساتھ ہی محبت بھرے الفاظ بھی درج تھے۔ بادشاہ نے تصویر دیکھی۔ لیکن نہ اپنی تصویر پہچانی اور نہ اپنے دستخط۔
لوگوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ انہوں نے سوچا کہ وہ اچانک بادشاہت ملنے کی خوشی میں اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ چنانچہ اُسے کھلی ہوا میں خوب سیر کروائی گئی۔ پھر اسے اسی دلدل اور بنجر علاقے میں لے گئے جسے جنت نشان بنانے کی آرزو میں وہ تڑپتا رہتا تھا۔ بادشاہ نے بغور دلدل پر نگاہ ڈالی اور پھر پوچھا ”یہ کون سی جگہ ہے، مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟۔“
”حضور یہ وہی دلدل ہے جس کے پانی کا رخ موڑ کر آپ اردگرد کے بنجر علاقے کو سرسبز بنانے کی مختلف اسکیمیں بنایا کرتے تھے۔ جسے ایک خوبصورت جھیل کی شکل دی جانے والی تھی جہاں دنیا کے گوشے گوشے سے سیاح آنے والے تھے۔“
بادشاہ نے ایک بار پھر غور سے دلدل کی طرف دیکھا اور کہا ”بخدا میں نے یہ جگہ زندگی میں آج پہلی بار دیکھی ہے۔ اُف، کس قدر غلیظ جگہ ہے یہ! کتنی بدبو آ رہی ہے! کاش میں یہاں کبھی نہ آتا! مجھے فوراً واپس محل لے چلو۔“
الغرض نئے بادشاہ کو نہ تو اپنے ولی عہد کے دور کی کوئی بات یاد آئی اور نہ اس نے ان دنوں کے کسی دوست کو پہچانا۔
چند سیانے لوگوں نے مشورہ دیا ”معلوم ہوتا ہے بادشاہ کی یادداشت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ بھلا دیکھیں تو سہی اپنے آپ کو بھی پہچانتا ہے یا نہیں۔“
ایک روز اس کے سامنے ایک خوب صورت سنہرے فریم والا قد آدم آئینہ لایا گیا۔ بادشاہ نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا، دیر تک نظریں جمائے رکھیں، پھر بولا ”یہ کون شخص ہے؟“
”آپ ہیں بادشاہ سلامت۔“
”نہیں نہیں۔۔۔ یہ میں تو نہیں۔ میں تو ان صاحب کو نہیں پہچانتا! میں نے تو آج پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔“
”جناب ذرا غور سے دیکھیے، دماغ پر زور ڈالیے، یہ آپ ہی ہیں۔“
”نہیں نہیں۔۔۔ میں نہیں ہوں۔ آیئے آپ لوگ خود دیکھیے اور فیصلہ کیجئے کہ آیا یہ میں ہوں یا کوئی اور۔“
حاضرین نے آگے بڑھ کر آئینے میں دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آئینے میں بادشاہ کے عکس کے بجائے ایک عجیب الخلقت چیز دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے گدھے جیسے لمبے لمبے دو کان تھے۔ بیل جیسے دو عدد سینگ۔ بیل ہی کی آنکھوں جیسی دو موٹی موٹی آنکھیں، جسم پر بندر کی طرح لمبے لمبے بال۔ بن مانس جیسا بھاری بھرکم جسم۔ سؤر کی سی تھوتھنی اور گینڈے کی طرح منہ تھا۔ لوگوں نے بادشاہ کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے معافی مانگی اور سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔
اس روز سے رعایا میں ہر شخص کے دل میں ایک نئی امید نے جنم لینا شروع کیا۔ ایک نیا ولی عہد، اس کی شاہی محل میں نظر بندی، موجودہ بادشاہ کا تختہ الٹ کر نئے ولی عہد کو بادشاہ بنانے کی امید۔

عزیز نے سن (۱۹۱۶ء تا ۱۹۹۵ء) ترکی زبان کے معروف طنز و مزاح نگار تھے۔ وہ استنبول کے مضافاتی جزیرے ”ہیبیلیادہ“ میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی میں ہی لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ اُن کے موضوعات معاشرے کی ناہمواری، سماجی رویے، سیاسی نظام وغیرہ تھے۔ اُنہوں نے جمہوریت کے فروغ کے لئے اپنے قلم کو وقف کر دیا۔ زبان میں انتہائی سلاست اور روانی ہے۔ اُن کا قلم جدیدیت کے تقاضوں سے کماحقہٗ واقف ہے۔ آج بھی طنز و مزاح نگار اُن کے طرزِ نگارش کو رہنما سمجھتے ہیں اور بصد افتخار پیروی کرتے ہیں۔ مندرجہ بالا تحریر کو اُن کی رہنما تحریر کہا جا سکتا ہے۔

سیّد عارف مصطفیٰ

آئی رے سردی

سردیوں کا موسم کب شروع ہوتا ہے، اس بارے میں الگ الگ اندازے ہیں لیکن اس پہ سب کا اتفاق ہے کہ جب لگنا شروع ہوجائے، اسی دن سے سردی شروع ہوجاتی ہے، تاہم اپنے آپ سے زیادہ کیلنڈر پہ بھروسہ کرنے والوں کے لیئے روایتی طور پہ سردی کا آغاز بالعموم دسمبر کے مہینے سے شمار کیا جاتا ہے۔ شاید اس لیئے کہ ہر برس دسمبر کی آمد پہ گرما گرم شاعری اور سرد مغالطوں کی نئی فصل کاشت ہوتی ہے اور ہر بار عاشق دسمبر کی آمد کا جس بیتابی سے انتظار کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اِس بار کے دسمبر میں تو وہ اپنے عشق کی کیاری میں ذاتی خون جگر سے سینچی گئی رومانی فصل کاشت کر ہی لیں گے لیکن پھر ہوتا یوں ہے کہ ان کا عشق سرد موسم کے دو تین ٹھٹھراتے غسل ہی میں کافی ٹھنڈیا جاتا ہے اور پھر وہ سارا خنک موسم کھانستے چھینکتے اور بڑا سا گرم ٹوپا پہنے رقیب کی مونگ پھلیاں ٹھونگتے اور اس سے فرمائش کرکے گرما گرم چکن سوپ پیتے گزار دیتے ہیں۔ یوں مزید عشق کرنے کے لیے وہ بھی سلامت رہتے ہیں اور رقیب کو بھی گزند نہیں پہنچتی۔

کچھ ہونہار عاشق اس موسم میں محبوب کے بھائی سے دوستی گانٹھ کے اس کی گلی میں بلکہ عین اس کے گھر کے سامنے اکثر بڑے دھڑلے سے لکڑیاں جمع کرکے الاؤ روشن کرنے میں کامیاب رہتے ہیں، یوں محبوب کا بھائی ہاتھ تاپتا ہے اور وہ دل تاپتے ہیں اور آنکھیں سینکتے ہیں۔

سردی کی کونپل چونکہ دسمبر میں سر اُبھارتی ہے چنانچہ کچھ خاص

قسم کے موسمی شعراء کی افزائش کا مہینہ بھی یہی ہے جنھیں ہم دسمبری شاعر کہتے ہیں کیونکہ ان کے کلام کا مرکزی نکتۂ سرد دسمبر کا گرم انتظار اور اس کا پر جوش والہانہ خیر مقدم ہوتا ہے، تاہم بالعموم یہ دسمبری کلام عام طور پہ تاثیر کے لحاظ سے ٹھنڈے موسم سے بھی کہیں زیادہ ٹھنڈا ہوتا ہے، اتنا ٹھنڈا کہ اس کی خنکی سے اکثر اس کی تمام ردیف اور قافئے اور اوزان وغیرہ بھی سکڑ جاتے ہیں۔

ویسے موسم سرما کی خصوصیات یوں تو بیشمار ہیں لیکن آغا ان میں سے خاص الخاص یہ قرار دیتے ہیں کہ سردی درحقیقت قدرت کی طرف سے ہر طرف سے کپکپانا سکھانے کا وہ سالانہ ٹریننگ پروگرام ہے جس سے ملازمت اور ازدواجی زندگی، دونوں ہی کو خوش اسلوبی سے بھگتانے میں بڑی اخلاقی مدد ملتی ہے اور اس سیزن سے حاصل کردہ سبق کے تحت بغلوں میں ہاتھ دبائے رکھنے اور کسی قدر خمیدہ پشت ہو کے چلنے کی عادت پڑ جانے سے معاملات کافی بہتر رہتے ہیں اور بعدازموسم سرما اس انداز کو معمول بنا لینے سے تو دنیاوی درجات کی بلندی تقریباً یقینی ہو جاتی ہے۔

ہجروفراق کے رموز پر گہری نظر رکھنے والوں کے مطابق تکنیکی وفنی لحاظ سے سردی کا موسم ہی درحقیقت سرد آہ بھرنے کا اصل موسم ہے۔ غیر محتاط اور ناتجربہ کار عاشق گرم مہینوں میں سرد آہ کھینچنے کی کوشش میں اپنی بچی کھچی توانائی اور محبوبہ کا اعتبار کھوتے ہیں۔ سرد موسم میں سرد آہ بھرنے پہ کسی کو اعتراض بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ پھر وہ بھاپ بن کے خارج ہوتی ہے اور اردگرد کے ماحول کے لیے بھی بہت راحت افزا ہوتی ہے۔ اس بارے میں آغا کی جانفشانی سے کی گئی ریسرچ کے نتائج یہ بتاتے ہیں کہ اگر دس ہزار عاشق شہر کے کسی ایک حصے میں جمع ہو کر ایسی بھاپ کے اخراج کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو اس کی اجتماعی حدت سے شہر میں ٹھنڈ کی شدت میں مناسب کمی لائی جاسکتی ہے۔

سرد موسم کی نسبت سے ایک اہم اور بڑی سچائی یہ بھی ہے کہ موسم سرما کی شدت کا اندازہ تو تھرمامیٹر یا کے لوّن میٹر قسم کے آلات کی مدد سے کیا جاسکتا ہے لیکن سردی کا احساس ان پیمانوں سے ماورا ہے کیونکہ ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ سردی اور بے عزتی کو

جتنا محسوس کرو، وہ اتنا ہی لگتی ہے۔ ویسے کسی بندے کا اختیار تو دونوں پہ نہیں لیکن سردی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے گرم کپڑے لادنے پڑتے ہیں اور اپنی بے عزتی کے احساس کو ختم کرنے کے لیے دوسروں کے کپڑے بھی اتارنے پڑتے ہیں۔ آغا کہتے ہیں کہ سردی طاقت کے پیمانوں کو الٹ دینے والے ایک ایسے زمانے کا نام ہے جس میں بھالو جیسے بھاری بھرکم افراد سب سے زیادہ کپکپاتے دِکھتے ہیں۔۔۔ جبکہ قدرت نے ان کے اندرون میں چربی کے ایک دو کمبل پہلے ہی گردا گرد لپیٹ دیے ہوئے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ سب سے زیادہ سردی کی شامت کے مارے معلوم ہوتے ہیں۔

ان کے برعکس ذرا ان چھچھڑا سی جسامت والوں کو دیکھئے کہ اکثر سخت سردی میں دانت پہ دانت جمائے نیلے پڑتے ہونٹوں کو بھینچے، محض چھلکا سی ٹی شرٹ پہنے اِدھر اُدھر رُلتے نظر آتے ہیں اور اپنے چند کلو والے منحنی وجود کا میدانی سپاٹ سینہ صرف ڈھائی پسلیوں کی کمان کے بل پہ اس حد تک تانے و نکالے، اِدھر سے

اُدھر لیفٹ رائٹ کرتے پھرتے ہیں کہ گویا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

لیکن زیادہ حیرت انگیز معاملہ تو اُن کا ہے کہ اقبال جن کے دم سے کائنات کا رنگین ہونا باور کرتے ہیں۔۔۔ (ویسے بھی اکثر حیرت انگیز معاملے خواتین کے گرد اگرد ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں) کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ سردی کے موسم نے ہمیشہ خواتین سے مات کھائی ہے۔ اگر کسی کو یقین نہیں آئے تو ذرا اس موسم میں ہونے والی کسی تقریب میں شرکت کر کے خود دیکھ لے، جہاں مرد حضرات گرم سوٹوں جیکٹوں اور سوئٹروں کے اندر پناہ گزین ہونے کے باوجود کانپ رہے ہوتے ہیں اور دوسروں کی بغلوں میں اپنے ہاتھ دبانے کی آرزو پالے، دانت پہ دانت جمائے کرسیوں اور صوفوں پہ پڑے ٹھٹھرتے پائے جاتے ہیں، وہیں یہ نازک اندام مخلوق موسمی حفاظتی اقدام سے یکسر بے نیاز ہو کے ایکدم باریک ریشمی و جاپانی کپڑوں میں ملبوس سینہ تانے، چٹخنا میک اپ سنبھالے، عجب مجاہدانہ خروش سے ہر سمت دوڑتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔

یہاں موسم سرما کے ایک خاص الخاص تحفے کا ذکر تو رہ ہی گیا۔۔۔ آپ کے ذہن میں اگر بھاپ اُڑاتے قہوے، جھلستی کافی یا اُبلتے سوپ آرہے ہیں یا پھر گاجر کے چکنے چپکتے حلوے اور خشک میوہ جات کی فہرست نظر میں ہے تو اپنی نیت اور سوچ پہ قابو رکھیے کیونکہ یہاں میری مراد فقط لحاف سے ہے جو کہ سردیوں میں بے تحاشا نیند لانے کا جادوئی اور مجرب دیسی آلہ ہے کیونکہ اسے اوڑھ کے جو نیند آتی ہے، ویسی نیند صرف سرکاری ملازموں کو دفتر میں اور مارے باندھے لائے گئے سامعین کو مذہبی محافل ہی میں آپاتی ہے۔

آغا اسے ایک ایسی عمل انگیز شے بتاتے ہیں کہ جس کے اوڑھنے سے کبھی کبھی دماغ سے پہلے ضمیر سو جاتا ہے۔ اب یہ ''سردی بچاؤ ڈھال'' محض گاؤں دیہاتوں یا غریب غرباء تک ہی محدود ہو گئی ہے کیونکہ اس کی روئی کئی نسلوں تک ساتھ دیتی ہے اور اسی لیئے اس میں کئی بزرگوں کی بسی باس ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہتی ہے اور اس یادآوری کو آئندہ بھی یقینی بنائے رکھنے کے لیے لحاف ترکے اور وراثت میں آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ آغا کے مطابق لحاف خصوصی رومانویت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ ان کی تیاری کا اہم ترین عنصر ڈورے ڈالنے جیسا جذبات انگیز عمل ہے۔ لحافوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ بوسیدگی سے بننے والے سوراخوں کو بھنا کے یا سٹپٹا کے دفعتاً بھرا یا چھپایا جاسکتا ہے اور کئی بچوں کو اس میں سلا کے شریک حیات سے محبت کے دو میٹھے بول بے خطر بولے جاسکتے ہیں۔۔۔ جبکہ موا کمبل سراسر انگریز کی دین ہے اور انہی کی طرح قطعی ناقابلِ اعتبار و بے وفا قسم کی شے ہے۔ کسی غفلت یا بدطینتی سے اس میں ایک بار کہیں سوراخ ہو جائے تو دن بہ دن بڑھتا ہی جاتا ہے اور یوں کئی خوفناک امکانات کے باعث بہت ڈراتا ہے کیونکہ پھر زیادہ سہانا وقت دوسرے کے کمبل کی طرف سے ایکدم ہوشیار اور مکمل چوکنا رہنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ کمبل میں تو ایک خامی مزید یہ بھی ہے کہ ذرا بے احتیاطی برتنے سے فوراً ''تنبیہی'' کرنٹ بھی مارتا ہے۔ ایک خرابی البتہ لحاف میں بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر اسے سردیوں کی سہ پہر میں ہفتے کی سہ پہر اوڑھ کے لیٹا جائے تو اتوار کی شام کو بھی اٹھنے نہیں دیتا۔۔۔

موسم سرما سے اپنے آغا کو جتنی الفت ہے خواجہ صاحب کو اتنا ہی زبردست بیر ہے اور بہت پرانا ہے۔ جس کی پہلی وجہ شاید یہ ہے کہ اس پورے موسم میں ان کی چچپاتی سُڑ سڑاتی ناک کی پھننگ ثابت قدمی سے ایسی سرخ رہتی ہے کہ ناک کا ڈھکن معلوم ہوتی ہے، جس کے عین نیچے سے ایک چشمہ سا دائم رستا نظر آتا رہتا ہے اور شاید اسی لیے اس موسم کی مذمت میں وہ بڑی وافر چڑچڑاہٹ سے بہت دور دور کی کوڑیاں لاتے ہیں اور اکثر یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ سرما ایسا واہیات موسم ہے کہ اس میں جذبے ہی نہیں، سوچ تک سکڑ جاتی ہے اور بندہ صحیح طرح غور و فکر بھی نہیں کرسکتا۔ حالانکہ وہ تو کبھی گرمیوں میں بھی غور و فکر کرتے نہیں پائے گئے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ اسی موسم کا کھڑاگ ہے کہ لقوے اور تقوے کو ایک ساتھ بیدار کرتا ہے اور زوجہ خواہ کتنی ہی حسین نازنین کیوں نہ ہو، نہانے پہ مجبور کرنے والی سازش کا آلۂ کار معلوم ہوتی ہے۔

خواجہ تو سردیوں میں نہانے والی خالی بالٹی کی طرف نظر بھر کے بھی نہیں دیکھتے کیونکہ کہتے ہیں کہ صرف اسے دیکھنے سے بھی بہت دیر تک ٹھنڈ لگتی رہتی ہے، تاہم خواجہ جب کبھی اہل خانہ کے پیہم تقاضوں اور احباب کے مسلسل اصرار پہ اگر کبھی دل کڑا کر کے نہانے کے لیے خود کو قضاوقدر کے حوالے کر بھی دیتے ہیں تو وہ اس موسم سرما کا گرم ترین دن ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کے غسل کی تیاری کا ماحول غسل میت سے صرف اسی حد تک کم ہوتا ہے کہ بس بیری کے پتے نہیں منگائے جاتے۔ سردی کی آمد کی اطلاع بھی بالعموم ہمیں خواجہ صاحب سے ہی ملتی ہے اور وہ یوں کہ وہ اچانک مسلسل کئی دن دکھائی نہیں دیتے اور پھر جب نظر آجائیں تو ذرا پہچانے نہیں جاتے، کیونکہ اپنا منہ بہت بڑے سے اونی ٹوپے میں پیک کیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے جس کے گرد اونی مفلر کی فصیل بھی حصار بندی کیے ہوتی ہے۔ ان کے نہایت گرم و مجہول ملبوس کو دیکھ کے لگتا ہے کہ جیسے سردی بھی کوئی کانا دجال ہے کہ جس سے جہاد کو خوب تیاری سے نکلے ہیں یا پھر کسی خلائی مشن کے لیے منتخب کر لیے گئے ہیں۔ سچ کہیں تو ان کی سردی کو دیکھ کے ہمیں یکا یک بہت سردی محسوس ہونے لگتی ہے اور جسمانی پارہ دھڑام سے کئی سینٹی گریڈ گر جاتا ہے۔

ویسے روایتی طور پہ خواجہ صاحب سرد موسم کے مقابلے کے لیے ہر برس ایک ایسے تاریخی اوور کوٹ کا سہارا لیتے ہیں کہ جو کبھی ان کے دادا جان کا تھا جو کہ ولولے ظرف جسامت اور گھیرے میں ان سے کہیں بڑے تھے اس لیے دیکھنے میں ایسا کم لگتا ہے کہ انہوں نے بری طرح اوور کوٹ پہنا ہوا ہے بلکہ یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے اوور کوٹ نے انہیں اچھی طرح سے پہنا ہوا ہے کیونکہ اس میں کم از کم ایک ڈیڑھ فرد کی مزید گنجائش ہمیشہ باقی معلوم ہوتی ہے۔ یہ تاریخی اوور کوٹ اپنی ہیئت اور ضخامت اور بوسیدگی کے لحاظ سے دیکھنے میں کسی پرانے تاریخی قلعے کا سا نظر آتا ہے اور خواجہ اس قلعے کے ایک کونے میں پڑے ایسے مانوس قیدی معلوم ہوتے ہیں کہ جسے اپنے زندان سے ایسی انسیت ہو چلی ہے کہ گویا اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے۔ وہ اس اوور کوٹ کی تاریخ اور افادیت اسی جوش اور ولولے سے بیان کرتے ہیں کہ جیسے تگڑی ٹپ ملنے کی امید میں تاریخی قلعوں کے گائیڈز کا شعار ہوا کرتا ہے۔

آغا کو البتہ سردی کا موسم بہت مرغوب ہے کیونکہ انہیں سویٹر پہننا بہت پسند ہے اور وہ بھی اپنی جوانی دیوانی کے زمانے کے، کہ جب وہ شوخ رنگوں اور بہت سی چناخ پٹاخ رنگین پٹیوں والے سویٹروں کے بل پہ کہیں نہ کہیں سے خوبصورت دکھتے تھے تاہم اس جمالیاتی مغالطے کی میعاد ایسے سویٹروں کے زیب تن رہنے تک ہی محدود رہتی تھی۔

بہر طور، یارِ من آغا اس راز کو پا چکے تھے کہ سردی ایک ایسا مہربان موسم ہے جو اپنے خوبصورت سویٹروں اور جیکٹوں کے سہارے قبر بجو کی سی شکل والوں کو بھی کہیں نہ کہیں سے قبول صورت بنا ہی دیتا ہے اور دلکش نظر آنے کے اس آسان راز کو سمجھنے میں انہیں ۶۰ اور ۷۰ کی دہائی کی بھارتی و پاکستانی فلموں سے خصوصی مدد ملی تھی کیونکہ اس دور کے ہر فلمی گانے میں کم از کم پانچ چھ خوبصورت

ہم موسیقی کو روح کی دوا سمجھتے ہیں۔ مہدی حسن صاحب نے فرمایا تھا: ”میں راگوں سے کئی بیماریوں کا علاج کر سکتا ہوں۔“ سو اس لحاظ سے انہیں پروفیسر کی بجائے ڈاکٹر کہلانا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر اور گلوکار کے نزدیک دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کھانستے ہیں اور دوسرے وہ جو نہیں کھانستے۔ کہتے ہیں ”گھر میں ہفتہ قوالی کراؤ تو ملیریا نہیں ہوتا۔“ مخالفین موسیقی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سارے مچھر قوالوں کے تالیوں سے مر جاتے ہیں۔ اگرچہ جب سے پی ایچ ڈی ڈاکٹروں کی تعداد بڑھی ہے تب سے ڈاکٹر ہونا بھی احتیاط طلب ہو گیا ہے۔ ازبکستان میں تو ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے۔ ویسے احتیاط کا تقاضا بھی یہ ہے۔ آج کل اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کا دور ہے۔ سپیشلسٹ وہ ہوتا ہے جو کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہے۔ اس حساب سے ڈاکٹر عارف لوہار ماہر امراض چمٹا، ڈاکٹر عبدالستار تاری ماہر امراض طبلہ، سجاد علی ماہر امراض پٹھہ و اعصاب اور ڈاکٹر نصرت فتح علی خان ماہر امراض پیٹی و پیٹ اور ڈاکٹر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ماہر امراض سر درد کہلاتے۔

مزاح پرسی از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

سویٹروں اور جیکٹوں کی نمائش ضروری سمجھی جاتی تھی کہ جن سے حاصل کردہ جمال ادا، سہارے کی بنا پہ ان میں کسی بھی انسانی شکل کا ہیرو بلا جھجک ڈال دیا گیا ہوتا تھا اور یوں اس گانے میں اپنے منہ سے دگنا تگنا مصنوعی بالوں کا بڑا سا جوڑا ہلاتی اور بڑی بڑی مصنوعی پلکیں پٹپٹاتی ہیروئن کا چہرہ بھلے رنگ بھرے نہ بھرے مگر ہیرو کا رنگا رنگ پٹیوں والا سویٹر ضرور رنگ بھر دیا کرتا تھا۔ اس ضمن میں خواجہ صاحب کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ زیادہ تر غلط بنے رومانی جوڑے سرد موسم کے ان غلط فہمی پرور حسین پہناوؤں کے بل پہ ہی بنتے ہیں اور پھر تا عمر آنسو بہاتے انہی کپڑوں سے چپچپاتی ناک پونچھتے اور یخنی کی بھاپ جیسی گرم آہیں خارج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ہمارے آغا صاحب کا موسم سرما سے ایسا والہانہ رشتہ ہے کہ ان کے بقول اس موسم میں ترنگ و مستی کو بالکل کھلا چھوڑ دیا گیا ہے اور کیف و سرور کو کوٹ کوٹ کے اثاث بھر دیا گیا ہے، حتیٰ کہ اس سیزن میں موم پھلی والے کو صرف دیکھنا تک بہت لذت بخش ہوتا ہے اور گرما گرم مونگ پھلی تو گویا بہشتی میوہ معلوم ہوتی ہے۔ فضاؤں میں ٹھنڈ پڑتے ہی گرم مشروبات جسم میں ایسی بے احتیاط چونچالی سی بھر دیتے ہیں کہ کسی قدر چھچھور پن بھی قابل معافی ہو جاتا ہے۔ ان دنوں گرم چکن سوپ بھی خوب فروخت ہوتا ہے جو دراصل اس مرغی کا غسل میت ہوتا ہے کہ جس کی تاریخ وفات بھی بھلائی جا چکی ہوتی ہے اور جس کے جسدِ خاکی کو گاہک کے تصور کو ذائقے اور اشتہاء کے امکانات سے بھر دینے کے لیے سوپ کے عین اوپر کئی دن مسولینی کی مانند لٹکا کے رکھا جاتا ہے۔

موسم سرما کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ یہ بھانت بھانت کی کولڈ کریمیں، لوشنز، ویسلینیں اور تیز خوشبوؤں والے پاؤڈروں کے انبار بھی ہمراہ لیئے آتا ہے، یعنی یہ سب سامانِ سَر مائی درحقیقت دکانداروں کی جانب سے گاہکوں کی جیب پہ خوشبودار ڈاکے ڈالنے کا موجب ہوتا ہے اور خواتین کی نیک نیتی اور تعاون سیان کے مردوں کی گرم موسم کی بچتیں سرد موسم میں اس لیئے دکانداروں کی تجوریوں میں منتقل کر دی جاتی ہیں تا کہ اس موسم کی بھڑکتی اکساہٹ کے باعث وہ کوئی بڑا گل کھلانے کے قابل نہ رہ پائیں لیکن ان گھروں کی پلی ہوئی خواتین کی چالا کی تو دیکھیے کہ وہ یہ بالکل بھول جاتی ہیں کہ یہی سامان تو جھریوں سے اٹی کسی نہایت کھردری سی بڑھیا کو بھی چکنی و ملائم سی جاپانی گڑیا بناتا ہے اور صاحبوں کے لیئے بیرون خانہ اشتہاء کے نئے امکانات جگاتا ہے۔

موسم سرما کی خوبیوں میں ایک نمایاں تر یہ بھی ہے کہ یہ کھانے کے لیے بہت سی ایسی ورائٹیوں کی غذائیں اور متعدد ماکولات و مشروبات بھی حاضر کرتا ہے کہ جن کے سامنے کسی بھی طرح کے پوشیدہ و محتاط مگر اور بخیل ندیدے کا پردہ بھی چاک ہو کے رہتا ہے۔ تاہم موسم سرما واضح طور پہ دولت مندوں کا موسم ہے کیونکہ اہلِ ثروت خشک میووں سے دل بہلاتے ہیں اور نادار لوگ ان کی قیمتیں سن کے اپنا خون خشک ہوتا محسوس کرتے ہیں۔ امراء حسبِ ایمان برانڈی یا قیمتی کافیاں پی پی کے اپنا خون گرماتے ہیں جبکہ رہا غریب۔۔۔ تو اس کا خون کھولانے کے لیے بجلی کا بل دیکھنا یا پھر عابدہ پروین کی کافی سننا ہی کافی رہتا ہے۔

اِس موسم کی اور کیا توصیف بیان کروں، بس چلتے چلتے یہ اور سن لیجیے کہ اپنے آغا صاحب اِس موسم کی ایک اضافی خوبی یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ یہی تو وہ زمانہ ہے کہ جس میں کفِ افسوس بڑے دھڑلے سے سب کے سامنے ملا جا سکتا ہے۔

سیّد عارف مصطفیٰ کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف سیاسی تجزیہ کار اور ایک دردِ دل رکھنے والے بلاگر ہیں۔ خاصی دبنگ شخصیت کے مالک ہیں اور سچ کہنے اور لکھنے میں کسی قسم کے لحاظ کے قائل نہیں۔ ایک بہت اچھے انشاء پرداز ہیں اور فکاہی اندازِ بیان کی وجہ سے خاصے مقبول ہیں۔ اُردو کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک میں اِن کی مساعی جمیلہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے فروغ میں بھی اِن کا خاصا ہاتھ ہے، کراچی جیسے آلام زدہ شہر میں فکاہی مجالس برپا کرنا انہیں کا کام ہے۔ ارمغانِ ابتسام کے لئے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

تاج رحیم

ضرورتِ رشتہ برائے مالکن بیوی

آپ نے بالکل صحیح پڑھا۔ ایک عدد مالکن کا رشتہ درکار ہے۔ عمر اور تجربے کی پابندی تو نہیں۔ ۲۵ یا ۳۰ سال کی عمر بری نہیں لیکن میری عمر ساٹھ سے اوپر ہے اور اس عمر میں جوان مالکن کے نخرے اور رعب داب اٹھانے کیلئے مجھے حکیموں سے رجوع نہ کرنا پڑے۔۔۔ اور یہ نہ ہو کہ اس کی ملازمت سے استعفےٰ دینے کی نوبت آ جائے۔ آئیڈیل عمر ۴۵ اور ۵۰ کے درمیان ہو سکتی ہے لیکن اس میں کچھ شرائط ہیں۔

۱۔ اس کی صحت اچھی اور چست ہونا ضروری ہے۔ یوں لگے جیسے ۲۵ سال کی دوشیزہ ہو۔

۲۔ پچاس سال عمر کی تمام زنانہ بیماریوں سے محفوظ ہو۔ شوگر کی لعنت سے ۱۰۰ فیصد آزاد ہو۔ جوڑوں کا درد پاس سے نہ گزرا ہو۔ سانس دُرست چلتا ہو۔ دل باقاعدگی کے ساتھ دھڑکتا ہو۔ جسم پر چربی بس اتنی ہو کہ سردیوں میں نمونیہ سے بچی رہے۔ نظر اتنی ٹھیک ہو کہ خواتین ڈائجسٹ خود پڑھ سکتی ہو اور مجھے انگلی پکڑ کر نہ چلانا پڑے۔ بال سر پر قائم ہوں۔ سفیدی کی کوئی بات نہیں۔ بازار میں ہر قسم کے رنگ مل جاتے ہیں۔

۳۔ وزن ۱۲۰ پاؤنڈ سے کم ہو تو اچھا ہے۔ کبھی اٹھانا پڑ جائے تو شرمندگی نہ ہو۔ میرا قد اندازاً ساڑھے پانچ فٹ ہے۔ اس مناسبت سے اس کا قد جتنا بھی کم ہو خیر ہے مگر بونی ہرگز ہرگز نہیں چلے گی۔

۴۔ امریکہ، کینیڈا یا برطانیہ کا پاسپورٹ ہونا لازمی ہے۔ میں خود ان تین ملکوں میں سے ایک کا شہری ہوں لیکن آج کل امیگریشن میں بہت وقت لگتا ہے تو کیا پتہ اسے امیگریشن ملنے تک میں زندہ رہوں یا نہ رہوں۔

۵۔ ہانڈی روٹی تو ہر گھر میں مالکن کی ذمہ داری ہوتی ہے تو یہ عزت افزائی بدستور اس کی قائم رہے گی البتہ اپنی وفاداری کے ثبوت میں صبح کی بیڈٹی کی ذمہ داری اس بندہ کے ذمہ۔

بیک گراؤنڈ چیک کی تفصیل میں جانے کی کچھ زیادہ ضرورت تو نہیں بس اتنا ہی معلوم ہونا کافی ہوگا کہ اگر اب تک کوئی ملازم بہ خطاب شوہر نہیں رکھا تھا تو سبحان اللہ۔ بالکل نہیں پوچھوں گا کہ کیوں نہیں رکھا بلکہ کہوں گا کہ اچھا ہی کیا جو نہیں رکھا۔ اگر پہلے کوئی تھا تو اس کا کیا بنا۔

نالائقی کے سبب ملازمت سے

برخواست کردیا، یا وہ زندگی سے ریٹائر ہوگیا۔ جو بھی اس کا حشر ہوا ٹھیک ہی ہوا ہوگا۔ بس اتنا خیال رہے کہ وہ اپنی نشانیاں نہ چھوڑ گیا ہو۔ کیونکہ میں ایک مالکن کو اپنی گدھا گاڑی میں گھسیٹ سکتا ہوں اس کے خاندان کو نہیں۔

میرا بیک گراؤنڈ تو بالکل سیدھا ہے۔ ساری عمر دل و جان سے نہایت وفاداری کے ساتھ ایک ہی بیوی کی ملازمت میں رہا لیکن بدقسمتی کہ اس نے تین چار سال پہلے زندگی سے ریٹائرمنٹ لے لی اور مجھے ان امپلائڈ ہی چھوڑ گئی۔ ٹمپریری یا پارٹ ٹائم ملازمت کے حق میں بالکل نہیں ہوں۔ نوکری ہو تو پکی ہو۔

سوچا تھا زندگی سے ریٹائر ہونے تک ویسے ہی ریٹائر رہوں مگر کبھی کبھی تنہائی تنگ کرنے لگتی ہے۔ اس لئے سوچا ہے کہ زندگی کی یہ گدھا گاڑی خالی کیوں کھینچتا رہوں ایک عدد مالکن کو بٹھا کر کھینچنے میں شاید ایک بار پھر اپنی اہمیت کا احساس ہو۔

اگر آپ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مجھ میں ہیں تو سبحان اللہ۔ تصویری تبادلے کی ضرورت نہیں اس میں وقت بہت لگتا ہے۔ بس بسم اللہ کیجئے اور وقت اور جائے ملاقات کا تعین کیجئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، پہلی ملاقات میں چائے کا بل میرے ذمہ۔ آپ میری درخواست کو فیس بک رسم کے مطابق لائیک کر کے مجھے اعزاز بخش کر دیکھ لیجئے۔ ان شاء اللہ، آپ کو کسی حال میں نا اُمیدی نہیں ہوگی۔

تاج رحیم صاحب کا تعلق پشاور سے ہے تاہم فی الوقت وہ انگلینڈ میں مقیم ہیں۔ پشتو، ہندکو اور اُردو کے خوبصورت ادیب ہیں۔ پشتو میں اِن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پشتو ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی خاصی دلجمعی سے سرانجام دے رہے ہیں، جن میں مزاح پارے بھی شامل ہیں۔ تاج رحیم صاحب کا اندازِ تحریر خاصا شستہ اور برجستہ ہے۔ مشکل سے مشکل بات کو کمال سادگی سے بیان کر لینا اُنہیں کا خاصا ہے۔

مراد علی شاہد

عرب اور ارب

عرب آج کل تین چیزوں کا بہت احترام کرنے لگے ہیں، زیتون، خاتون اور قانون کیونکہ ان تینوں چیزوں کی اہمیت کو عربوں نے جان لیا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ اب زیتون کا احترام اور قانون کی پاسداری کرتے ہیں، رہ گیا سوال خاتون کا تو عرب خاتون کو عینین کی تسکین سمجھتے ہوئے دل و دماغ کی آنکھوں میں بساتے ہیں۔ مشہور ہے کہ عرب کھجور، اونٹ اور حرہ (خاتون) کے لئے کچھ بھی قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ عرب میں نماز کے علاوہ سب سے بڑے اجتماعات بھی وہیں ہوتے ہیں جہاں اونٹ اور خواتین جمع ہوں۔ بلکہ خاتون اور کھجور کو دیکھتے ہی ان کی رال ٹپکنا شروع ہو جاتی ہے۔

خوشبو عورت کی کمزوری جبکہ عورت عربوں کی کمزوری سمجھی جاتی ہے، خواتین عطر اور پرفیوم لگاتی نہیں بلکہ انڈیلتی ہیں۔ کچھ خواتین مردوں کو مسحور کرنے کے لئے خوشبو لگاتی ہیں جبکہ کچھ دوسروں کو بے ہوش کرنے کے لئے۔ عرب میں یہ بات مشہور ہے کہ خواتین گھر سے باہر ماسوا خوشبو لگانے کے کچھ نہیں کرتیں اور مرد گھروں میں کوئی کام نہیں کرتے حالانکہ مردوں کے گھروں میں کام کرنے کی وجہ سے ہی ان کے آنگن میں دس دس بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔

عرب فیملی پلاننگ کی بجائے دوسری شادی پر یقین رکھتے ہیں۔۔۔ بلکہ ان کا یقین کامل چار شادیاں ہیں۔ عربوں نے فیملی پلاننگ کا حل یہ نکالا ہے کہ ایک بیوی سے وہ چار سے زائد بچے نہیں لیتے۔ اگر پانچواں بچہ لینے کی خواہش ہو تو شادی ایک اور کر لیتے ہیں اور پھر چار بیویوں سے بیس پچیس بچے فیملی پلاننگ کا منہ توڑ جواب سمجھتے ہیں۔ میرے ایک عربی دوست کی تین شادیوں میں سے کل پندرہ بچے ہیں، جب اس سے میں نے کہا کہ یار بچے تو دو

ہی اچھے ہوتے ہیں تو معاً بولا کہ ان میں سے ان شااللہ دو ہی اچھے نکلیں گے، باقی اونٹ چُرانے یا چَرانے کے کام آئیں گے۔

عرب دلہنیں شادی پہ سفید لباس زیب تن کرتی ہیں، اس خیال سے کہ ان کی زندگی کا روشن دن شروع ہونے والا ہے حالانکہ نئی زندگی اور شادی کی شروعات دن کو نہیں ''رات'' کو ہوتی ہے۔

عہدِ حاضر میں تیل اور گیس کی فراوانی سے اکثر عرب اب ارب پتی بن گئے ہیں۔ عربوں کو ارب پتی بنانے میں کفالت سسٹم کا بھی اتنا ہی ہاتھ ہے جتنا کہ تیل اور گیس کا۔ کفالت سسٹم کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اجیر کے شب و روز visa status سے منسلک ہوتے ہیں۔ عرب دنیا میں مشہور روایت ہے کہ افریقہ کے جنگلوں سے ایک شیر کو لا کر چڑیا گھر میں رکھا گیا۔ ملازمین روزانہ شیر کے سامنے ہری ہری گھاس لا کر ڈال دیتے، چند روز گزرنے کے بعد ایک دن شیر احتجاجاً دھاڑا کہ میں ایک شیر ہوں اور شیر گھاس نہیں، گوشت کھاتا ہے، اس لئے مجھے گھاس نہیں گوشت دیا جائے۔ ملازمین نے اس پر جواب دیا کہ اے جنگل کے بادشاہ یہ بات ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ شیر ہی ہو مگر آپ جس ویزہ پر یہاں لائے گئے ہیں وہ شیر کا نہیں بکری کا ہے اس لئے ہم آپ کو گھاس دینے پر مجبور ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو گوشت دیا جائے تو تو فوراً نقل کفالہ کروا لیجیے وگرنہ اپنے آپ کو گھاس کھانے کی عادت ڈال لیجئے۔ سنا ہے آج کل وہ شیر بھی گھاس ہی کھا رہا ہے۔

عربوں کی نقل میں اب بہت سے پاکستانی بھی ارب پتی بنتے جا رہے ہیں مگر ان دونوں میں یہ فرق ہوتا ہے کہ عرب شادی سے قبل بھی ارب پتی ہی ہوتے ہیں جبکہ پاکستانی اسے ''زنانی کی قسمت'' کہہ کر جواب گول مول کر جاتے ہیں۔

عرب شادیوں پر پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں کہ ''مال'' اچھا ہو تو قیمت نہیں دیکھی جاتی، جبکہ ہمارے ہاں وہی ''مال'' دیکھا جاتا ہے جو شادی کے بعد ''مالو مال'' کر دے۔ عرب چونکہ پہلے ہی سے ارب پتی ہوتے ہیں اس لئے پتنیوں کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں تو چاچے کی بیٹی ہوتی ہے اور اگر اوپر سے ماں کی طرف سے ''چڈو'' اور ''تھلے لگا'' جیسے القابات سے بھی نواز جا رہا ہو تو سمجھ لیجئے کزن کے ساتھ ساتھ بیوی اچھی بینک بیلنس کی مالک بھی ہے۔

خاوند ارب پتی ہو تو شادی کے بعد بیوی اس کا ایسا حال کر دیتی ہے کہ ارب پتی سے سیدھا چائے کی پتی بیچنے والا بیوپاری بنا دیتی ہے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں ایک روایت مشہور ہے کہ دو خواتین عرصہ دراز کے بعد ملیں تو حسب عادت حال احوال کے بعد من پسند موضوع خاوند کی چغلیاں شروع کر دیں، ایک پوچھتی ہے ''سنا، تیرا خاوند کیا آج بھی تیرے ارد گرد چکر لگاتا ہے''

''نہیں، اب مجھے بچوں کے چکروں میں ڈال رکھا ہے۔''

دوسری خاتون نے کہا ''اور سنا تیرا خاوند کیا کرتا ہے۔''

''میں نے تو اپنے خاوند کو کروڑ پتی بنا دیا ہے!''

''اچھا تو وہ پہلے کیا تھا؟''

''ارب پتی!!''

بحیثیتِ مسلمان، ہم عربوں کے احترام و تقدس کو معتبر خیال کرتے ہیں، اب جبکہ عربوں نے اربوں کے تقدس کو معتبر سمجھ لیا ہے تو ہمیں بھی ان کی تقلید میں اربوں کو اعلیٰ ترجیحاتی معیار پر رکھ کر اس کے تقدس کو پامال نہیں کرنا بلکہ احترام کرتے ہوئے جتنے بھی ارب اکٹھے ہو سکیں ان میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑنا کیونکہ جیسے حالات ملک کے چل رہے ہیں ایسے حالات میں عرب اور ارب دونوں کی ملک کو ضرورت ہے۔

مراد علی شاہدؔ صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر ''شعبۂ پاکستان اسٹڈیز'' فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ ''قندِ شیریں'' کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں جو ایک موقر اخبار میں تواتر سے شائع ہو رہا ہے۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

حقّہ

عامر راہداری

حقّہ دیہاتوں کا قومی جانور ہے۔ شہروں میں لوگ اپنے باپ دادا کو بوڑھا ہونے پر اولڈ ہومز میں جمع کرا دیتے ہیں، جبکہ دیہاتوں میں ایسے بے کار بزرگوں کو حقے پہ لگا دیا جاتا ہے، بلکہ کئی گھروں میں تو حقے کو باقاعدہ ایک فرد کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

حقہ دیکھنے میں بالکل ایک ایسے نحیف ونزار غریب شخص جیسا ہوتا ہے جس کے جسم پر کپڑے تو ہوتے ہیں لیکن پیٹ میں سوائے پانی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

دیہاتوں میں غربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے لوگ اتنا خود اپنے اوپر خرچ نہیں کرتے جتنا حقے کے پھول بوٹوں پہ کر دیتے ہیں۔ آپ یقین کرو نہ کرو لیکن ہم نے اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے ایسے سجے سجائے خوشحال حقے بھی دیکھے ہیں جن کو دیکھ کر اچھی بھلی پارلر سے تیار شدہ دلہن بھی حسد کرنے بیٹھ جائے۔

حقے کی اگر تاریخی حیثیت دیکھی جائے تو اس کے کھرے مغلیہ سلطنت سے جا ملتے ہیں۔ ویسے بھی نلکا، چارپائی، ٹائر اور حقہ شکل سے ہی ایسے لگتے ہیں کہ انہیں ضرور مغلوں نے ایجاد کیا ہوگا۔ مغلوں کے متعلق مشہور ہے کہ یہ وقت کی بہت قدر کرتے تھے۔ فارغ رہنے سے اتنی شدید نفرت کرتے تھے کہ کسی دن اگر ایک آدھ گھنٹہ فارغ آ جاتا تو اسے ضائع کرنے کے بجائے ایک آدھ شادی ارشاد فرما لیتے تھے۔ کئی مغل تو شادی سے ”فارغ“ ہوتے ساتھ ہی ایک اور عدد شادی تک چل دیتے تھے۔ سو جب مغلیہ سلطنت سے شادی کے لائق عورتیں ختم ہوگئیں تو کسی انتہائی ذہین مغل کے ذہن میں حقہ بنانے کا آئیڈیا آیا اور پھر اس نے یہ منحنی شکل کی مشین بنا کر دکھا دی جس کے استعمال سے مغلیہ حکمرانوں کے پاس نہ تو فراغت باقی رہی اور الحمدللہ نہ ہی سلطنت۔۔۔

سائنس کے پاس حقے کے بارے میں کوئی خاص انفو نہیں ہے بلکہ

خود کو ہی اہم ترین سمجھنا اور اس پر پورے شرح صدر سے یقین رکھنا اور کچھ ہو نہ ہو، ایک مزاحیہ اعتقاد ضرور ہے۔ ہمارے ایک واقف کار نرگسیت کے پرلے درجے کے مریض ہیں اور اس بیماری میں اتنے طاق ہیں کہ وہ جوان جہان ہو کر بھی، نرگسیت کی رو میں بہہ کر ''نرگس'' کو بھی پسند نہیں کرتے۔
ڈاکٹر عزیز فیصل

سائنس کو ابھی تک سمجھ ہی نہیں آسکی کہ یہ ہے کیا بلا؟ سنا ہے کسی انگریز نے اس پر خاصی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ نکال کر رکھ دیا تھا کہ یہ کسی نئی نسل کے ڈائناسور کے فوسلز ہیں جو صرف پاکستان و ہندوستان میں پایا جاتا تھا واللہ عالم بالصواب۔۔۔

حقہ ظاہری طور پر چار اجزائے ترکیبی سے مل کر بنتا ہے، سب سے اوپر اس کا چہرہ مبارک، جس میں انگارے اور تمبا کو وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ سر کے نیچے کمر شروع ہوتی ہے اور کسی حسینہ کی بل کھاتی ہوئی پتلی کمر کی طرح رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ شاعر نے ایسی ہی کمروں کے بارے میں فرمایا تھا ۔

تمہارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے، کس طرح کی ہے، کدھر ہے؟

تیسرا حصہ وہ نلی ہے جس کے ایک سرے پر انسان جبکہ دوسرے سرے پر یہ بیوقوف ہوتا ہے۔ چوتھا حصہ اس کا پیٹ ہوتا ہے جس میں سوائے پانی کے اور کوئی اہم چیز نہیں ہوتی۔ لیکن سننے میں آیا ہے کہ حقے کے پانی سے کئی بیماریوں کا علاج ممکن ہے جن میں بواسیر سرفہرست ہے۔

حقے کے ایک دو نہیں کئی ہزار فائدے ہیں جیسے کہ ہمارے ایک دوست کے گھر چور گھس آئے، گھر میں لاکھوں روپے کا سامان موجود تھا۔ چور دیوار پھلانگنے لگے تو سامنے صحن میں حقے پر نظر پڑی اور واپس مڑ گئے۔ چوروں نے دو تین چکر لگائے اور حقے کو دیکھ دیکھ کر واپس مڑتے رہے اور ہر بار یہی سمجھتے رہے کہ کوئی بزرگ صحن میں بیٹھا چلہ کاٹ رہا ہے۔ یوں ایک حقے کی بدولت لاکھوں کا سامان بچ گیا۔

حقے کے اور بھی کئی استعمال ہیں، مثال کے طور پر آپ اسے مشکل وقت میں ایزائے بندوق بھی استعمال کر سکتے ہیں، پھانسی کا دل کر رہا ہے تو اس کے ساتھ لگی نلی کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ گھر میں آپ کی کوئی نہیں سنتا تو آپ حقے کو سنا سکتے ہیں۔ کرکٹ کھیلنے کا من کر رہا ہے تو آپ اسے وکٹوں کے طور استعمال کر سکتے ہیں۔ وکٹیں موجود ہیں بلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلا بھی موجود ہے تو آپ اسے فیلڈر بنا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور اس بات کی مجھ سے چاہے قسم لے لیں کہ حقہ کئی پاکستانی فیلڈرز سے اچھا فیلڈر ثابت ہو سکتا ہے۔ شوہر حضرات ''بیویانہ حملے'' کی صورت میں اسے ڈھال کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ دوسری جانب مستورات کے لیے تو حقہ کسی نعمت سے کم ہے ہی نہیں۔ جالے صاف کرنے ہوں تو حقہ حاضر ہے، واش بیسن میں کوئی چیز پھنس گئی ہے تو حقے سے نکالی جا سکتی ہے۔ مچھر بھگانے ہیں تو حقے کی دھونی دے دیں، شوہر سدھارنا ہے تو حقے کی دھونی دیں۔ ہتھیار کا ہتھیار نشے کا نشہ۔۔۔

حقے کا نقصان کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں اس کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ سگریٹ پینے سے زندگی کے آٹھ منٹ کم ہوتے ہیں جبکہ حقے میں ایسا کوئی سسٹم نہیں ہے اس میں بندہ ایک ہی بار فیوز ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ بہترین سسٹم ہے۔

آخر میں اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا ۔

یہ ایک حقہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سگریٹوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

عامر راہداری کا تعلق لاہور سے ہے اسی باعث لاہوریوں جیسا کھلا ڈھلا اور برجستہ پن ان کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی، آرٹسٹ اور لکھاری ہیں۔ طنز و مزاح لکھنے میں ایک جدا اسلوب کے حامل ہیں۔ عموماً روزمرہ زندگی سے متعلقہ موضوعات کو نشانے پر رکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں بہت عرصے سے لکھ رہے ہیں، بے قاعدگی غالباً ان کی ہمہ گیر مصروفیات کا شاخسانہ ہے۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

مُفتی

کوفتے پکاتے ہوئے بیگم بڑبڑا رہی تھی کہ ہائے ربا آج کچھ اچھا پک رہا ہے گھر میں، کہیں مفتے آنہ دھمکیں ورنہ سارے کوفتے چٹ کر جائیں گے۔

ہم نے ذرا کان لگا کر سنا تو شرارت سوجھی اور نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے اعلان کیا ''دوست آرہے ہیں ذرا اچھے سے پکانا۔''

پھر کیا تھا، مفت میں جنگ مول لی۔۔۔ایسی ایسی صلواتیں میرے نادیدہ یاروں کو سنا دیں کہ شیطان کے بھی کان کھڑے ہوگئے۔ہم بھی کان لپیٹ کر پتلی گلی سے نکل لیے تا کہ توپوں کا رخ ہماری طرف نہ ہوجائے ورنہ پھر ہمارا سر ایسا پلپلا ہو جاتا کہ نیورو سرجن کے بس کی بات بھی نہ رہتی۔

گھنٹہ دو گھنٹے بازار سے لوٹ کر آئے تو تیز نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ ہم تو سارا قضیہ بھول بھال گئے تھے لیکن بیگم نام کی شیرنی تو جیسے شکار پر جھپٹنے والی تھی، جٹ سے بولی ''لے آئے خیر سے مشٹنڈوں کو۔''

''ہیں۔۔۔مشٹنڈے؟؟ کہاں کے مشٹنڈے۔۔۔کون سے مشٹنڈے۔'' ہم نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''وہی نگوڑ مارے تمھارے مفت خورے دوست جو ابھی نکلتے ہوئے کہا تھا۔'' بیگم نے یاد دلایا۔

اووووہ زبان پر آتے آتے حلق میں کہیں اٹک گیا۔ ''وہ تو میں نے یونہی چڑانے کے لیے ہنکی پھینکی تھی یار اور تم سنجیدہ ہو گئیں۔۔۔بھلی لوکے۔''

''اچھا یعنی تم نے مذاق کیا تھا۔'' بیگم مزید بپھری۔

''جی بالکل!''

انتہائی بھونڈا مذاق تھا۔''

''بھلا وہ کیسے؟''

''کچھ نہیں۔۔۔چلو تمھارے حصے کے کوفتے ہمسائی کو بھیج دوں گی اور تم کرتے رہنا گزارہ ساگ پر۔۔۔یہی تمھاری سزا ہے۔''

اور ہم اِس عجیب و مہیب سزا پر ہکے بکے۔

ایک تو یہ مفتے بھی ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔اب دیکھئے ناں، ہماری بیگم کو ہماری چائے نوشی کی اتنی فکر رہتی ہے کہ اکثر صبح ڈیوٹی پر نکلنے لگتا ہوں تو کہتی ہے ''ایک تھرموس خرید لاؤ، گھر میں تو جتنے

بھی ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو تم سکول لے جاؤ۔ میں چائے ڈال دیتی ہوں، تم سکول میں وقتاً فوقتاً پیتے رہنا۔"

لیکن ہم یہ کہہ کر اُسے چُپ کرا دیتے ہیں کہ وہاں تو مجھے ایک پیالی بھی نصیب نہیں ہوگی کیونکہ مفتے بلا اجازت انڈیل انڈیل کر پی جائیں گیا ور مجھے خبر بھی نہ ہوگی۔

اکثر سرِ راہے بھی کچھ مفتے ہاتھ ہلا ہلا کر گاڑی میں سوار ہونے کے لیے اشارے دیتے رہتے ہیں لیکن ہم بھی انتقاماً رفتار بڑھا دیتے ہیں کہ ہمیں بھی سات سات آٹھ آٹھ کلومیٹر پا پیادہ چلنے پر مجبور کرنے والے بھی زن سے گزر جایا کرتے ہیں، ہمیں تو کبھی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کسی نے اٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ یوں بھی ہماری فطری خودداری ہمیں اشارہ بازیوں سے منع کرتی رہتی ہے۔ میری ذاتی بیگم کا بھی قولِ زرّیں ہے کہ کلجگِ نو میں راہگیروں کو گاڑی میں مت بٹھایا کرو، ایسا نہ ہو کہ مفتے میں گاڑی بھی ہاتھ سے جاتی رہے اور جان بھی کیونکہ چوراچکوں کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ میرا تعلق کسی سیاسی گھرانے سے نہیں۔

ایسا ہی ایک وقوعہ ہمارے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ہوا یوں کہ موصوف نے ایک مفتی (مفتے کی تانیث آپ لوگ داڑھی والا نہ سمجھ لیجئے گا ویسے) کو ازراہِ ہمدردی گاڑی میں بٹھا لیا۔ محترمہ اترتے ہوئے دھمکانے لگی کہ پیسو دو ورنہ شور مچادوں گی کہ اس مردوے نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا، بٹوہ کھولا اور ہزار کا واحد کرارا سانوٹ نکالا جسے لپک کر بی مفتی یہ جا وہ جا۔

ایک تو مفتے میں ملی کرسی بھی پیسہ بنانے والی مشین ہوتی ہے کہ اس پر براجمان مفتا اپنے اختیارات کا ایسا بے دھڑک استعمال کرتا ہے کہ سالوں کا مال مہینوں میں ڈکار جاتا ہے اور معدہ "ھل من مزید" پر مصر رہتا ہے۔ ایسے مفتوں سے پاکستان اٹا پڑا ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے، نظام نے خاک ٹھیک ہونا ہے۔

کچھ مفتے تو ہر ہفتے کسی نہ کسی دعوت میں نظر آتے ہیں کہ پیٹ پوجا ایسے مفتوں کا بہترین مشغلہ جو ٹھہرا۔ خدا کی پناہ، ایسے مفتے جبہ و دستار میں بڑے ملتے ہیں اور دربار و مزارات پر تقاریب کے بہانے اپنے پیٹ کا پھیلاؤ اور وجود کا تناؤ بڑھاتے رہتے ہیں۔ کچھ کا تو اپنی رعایا پر اس قدر رعب رہتا ہے کہ ادھر اس نے مطالبہ کیا اور ادھر خوان کے خوان من وسلویٰ حاضر۔۔۔ ہم اکثر سوچتے رہتے ہیں کہ جس کھاپے کے حصول کے لئے پسینہ نہ بہایا گیا ہو، اس کا سواد بھی ہوتا ہوگا؟

مفتے سوچ بھی انسان کا کباڑا کرنے کے لیے دماغ میں ایسے آدھمکتے جیسے کوئی کسی گندگی سے بھری ڈھیر پر ٹھونگے مارتے ہیں۔ کبھی خرچے کی فکر تو کبھی ضروریاتِ زندگی کی عدم دستیابی پر ذہن کے کل پرزے ہل کر رہ جاتے ہیں۔ انسان ویسے بھی بے صبرا واقع ہوا ہے، اس پر بلا جواز مفتے تفکرات کی آمد احساسِ غم دو آتشہ کر دیتی ہے۔ اور وہ کل کہیں رو رہا ہوتا ہے۔

مفتوں سے ہاسٹل کی زندگی کے چند دلچسپ واقعات یاد آئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب جوانی پوری شدت سے خون میں پھدکتی پھر رہی تھی۔ بالی عمریا کے نخرے بھی عجیب گُل کھلاتے ہیں، مستزاد اس پر جب حلقۂ احباب بھی ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوں۔ علی زمان (مونچھاں والی) جس کے ہاتھ اتنے نازک اندام اور پتلے پتلے تھے گویا الہڑ حسینا کا ہاتھ تھامے اٹھکیلیاں کر رہے ہوں، شمشاد (ڈبہ سر) ناصر سیماب اعلیٰ پائے کے آرٹسٹ ہے، جس کی موجودگی میں اساتذہ بھی چوں نہیں کر سکتے تھے۔ بس اس کا مسئلہ سکیل ڈرائنگ ہی تھا ورنہ ماڈل ڈرائنگ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اعجاز احمد (الخوازمی) چونکہ آرٹ ٹریننگ کے دوران ایم ایسی بائیو کمیسٹری پر بھی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ فرمان گُل ورتیروال ساتھ محمد یوسف جو بڑے شریف بندے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر بہت سارے احباب بھی تھے لیکن یہ سات ساتھ کا ٹولہ وہ ٹولہ تھا جس سے ہاسٹل کے ایک سال میں تقریباً سارا تھانہ (سوات) لرزہ بر اندام رہتا تھا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ ہمارے ساتھ کالج میں کوہستانی پی ٹی سی ٹریننگ لے رہے تھے جبکہ ہم فنونِ لطیفہ سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ ہاسٹل میں ہر وقت گرما گرمی رہتی تھی۔ میس میں بھی دھینگا مشتی سے جگہ مل پاتی اور باورچی آلو کھلا کھلا کر ہمارے پیٹ کو آلو کی

بھلائے دیتے تھے کہ سات سو روپے مہینہ میں یہی آ سکتا تھا۔

ہمارا اعتراض اُن (پہاڑیوں) پر یہ تھا کہ ہاسٹل کا (مفتا) برادہ کھا کھا کر لیٹرینوں کا وہ حشر کرتے کہ ہم جیسے نفیس باہر نکلتے مواد میں کھایا اُلٹی کر سکتے تھے بلکہ علی زمان زنانی مزاج تو بھڑے بغیر نہ رہ سکا اور مار کھا بیٹھا، جس کا بدلہ لینے کے لیے ہماری ٹولی کا جنون انتہا کو چھو رہا تھا۔ عین چکدرہ چوک میں ایک خیر خواہ مخبر کی اطلاع پر کیل کانٹے سے لیس، ہماری دس نفر پر مشتمل ٹولی سات ہم اور تین شانگلہ و بنیر کے دوست، چھ بھگوڑے کو ہستانیوں کو وہ رگڑا دے گئے کہ پھر ساری ٹریننگ بخیر و عافیت ختم ہوئی اور آخر میں تو انہوں نے خود صلح کی درخواست کی، حالانکہ درگت بھی اُنہیں کی بنائی گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے جناب فضل محمود صاحب پرنسپل کالج ہذا کے عتاب میں آ کر ہم ہاسٹل بدر ہو چکے تھے اور اسی تھانہ شہر میں ایک حجرہ کرائے پر اٹھا کر ہاسٹل سے زیادہ ٹھاٹ میں رہ رہے تھے۔ اپنا پکاتے اور اپنا کھاتے۔۔۔ ہاسٹل روٹین سے تو ویسے بھی نالاں تھے، اس لیے وہاں ایک ماہ بھی نہ ٹک سکے اور جھگڑا کر کے نکال دیے گئے۔

ایک طرح سے یہ جھگڑا ہمارے لیے سود مند ثابت ہوا تھا۔ کلاسیں لینے کے بعد حجرہ کھانا خوش گپیاں اور سوات کے نظارے ہی ہمارا معمول بن چکا تھا۔ ہاں ایک بات تو بھول ہی گیا کہ اپنے دوستوں نے میرا لقب بھی خاصا چسپاں (نتھی) رکھا ہوا تھا ''کیش فیکٹری'' وجہ تسمیہ اس کی یہ تھی کہ کیش کے بجائے کیش سگرٹ کی ڈبیا ہمہ وقت جیب میں رہتی تھی۔

اتنی طویل وضاحت کے بعد اب آتے ہیں اپنے موضوع کی طرف کہ جب کچھ پکاتے، جس میں ہم ہی سب سے اچھے کک تھے (اندھوں میں کانا راجہ سمجھ لیجئے) تو ہمارے ایک استاد محترم فضل ربی جو کہ تقریباً ہمارے ہی ہم عمر تھے اور جن سے سارا سال سوائے گپ شپ کے کچھ سیکھا ہی نہ تھا، کیونکہ ناصر (سیماب) جیسے بزرجمہر کے سامنے کون چونچ ہلا سکتا تھا، اس لیے یہ سفارشی اساتذہ بھی دبکے رہتے، مبادا نیچر سٹڈی سکھاتے ہوئے کہیں کوئی غلطی نہ پکڑی جائے اور استادانہ بھرم ٹوٹ جاتا تھا، کبھی کبھار ہماری دعوت پر ہمارے ساتھ کھانے میں شامل ہو جاتے۔

ایک دفعہ کیا ہوا کہ وہ اپنے ساتھ محترم بختیار صاحب کو بھی لے آئے جو ہمیں سکیل ڈرائنگ (فری ہینڈ) سکھاتے جس کو میرے سوا کسی نے سیکھا تک نہیں اور جب کوئی اٹک جاتا تو استاد کے بجائے مجھ سے رجوع کرتے کیونکہ استاد نے بودی کی اولاد (وٹنے بچیہ) کے سوا کچھ جواب دینا ہی نہ تھا۔

صاحب پھر کیا تھا جب بھی ہم سپیشل پروگرام بنا لیتے یعنی گوشت چاول یا فرائی مچھلی کا تو جیسے استاد محترم بختیار صاحب کے نتھنے دور سے خوشبو سونگھ لیتے اور بے وقت کے مہمان بن جاتے، یعنی وہ مفتا بادشاہ تھا۔

ہونا تو چاہیے تھا کہ چونکہ وہ لوکل تھے تو اس اکلوتے سال میں ہم جیسے مسافروں کی ایک ضیافت تو بنتی مگر یہاں تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے دے رہا تھا بلکہ رال ٹپکائے جا رہا تھا۔

سارے دوست چونکہ متوسط طبقے کے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ماہانہ خرچ کا بڑھ جانا گھر والوں کو بھی مشکوک کر سکتا تھا، اس لیے سب نے ایک متفقہ قرارداد منظور کر کے مجھے تھمادی کہ اس بار صرف مرچوں والا نسخہ ہی کارگر ہوگا تاکہ باقی کے مہینے سکون سے گزرے۔

لیکن ہائے ری قسمت کہ وہ دعوت بھی سی سی کر کے اور نکسیر پھوٹ پھوٹ کر یوں اُڑائی گئی جیسے مفتے نے اس بار بہترین باربی کیو کا لطف اٹھا لیا ہو۔ اب ہم سب سر پکڑ کر نہ رہ جاتے تو کیا کرتے صاحب۔

بیشک استاد جیسا بھی ہو قابل احترام ہے لیکن موصوف ہاسٹل سے نکال دینے پر ہمارا دفاع تو کجا احتجاج تک نہ کر سکے تھے۔ بھلا اُنہیں کیا پڑی کہ فضل محمود صاحب کے سامنے اپنی عزت کیونکر خراب کرتے اور وہ بھی ہماری وجہ سے۔۔۔ ہم سب تو اُڑن پنچھی ٹھہرے، سال گزار کر اُڑ جاتے لیکن وہ کو لیگ تھے بلکہ اس کے سربراہ تھے۔ اب ہمارا حجرہ رات ڈھلے کبھی سبز چائے کبھی دودھ پتی کے دوروں سے گرم رہتا اور ہمارا ہفتے کا جیب خرچ دو دن میں اڑنچھو ہو جاتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ہمارا کرایہ دار بڑا جی دار

پاکستان کی نوجوان لڑکیوں میں نمائشی باتیں اس قدر مروج نہیں جس قدر نمائشی حرکات۔ وہ مغربی خاتون کی طرح بظاہر بے تعلق باتوں سے اپنی شخصیت کی رنگینی کا اظہار نہیں کرسکتیں۔ اگر کوشش بھی کریں تو نمائش عریاں ہو جاتی ہے۔ اول تو عام طور پر ان کا غیر مردوں سے ملنا جلنا ممنوع نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس رسمی خلیج کی وجہ سے جو دونوں کے درمیان حائل رہتی ہے نمائشی حرکات کو نمائشی باتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ چونکہ حرکات کی اپیل دور تک چلتی ہے۔ شاید رسمی اخلاق اور شرمیلے پن کی وجہ سے ہندوستانی لڑکی کی اپیل ایک بے نیازی سے پیدا کی جاتی ہے۔ اگر چہ اسے واضح کرنے کے لئے کبھی کبھار انکھیوں سے دیکھنا ضرور ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں گفتگو کی اپیل ممکن نہیں چہ جائیکہ گفتگو میں مغربی خاتون کی سی ہمدردی اور احساس کی چاشنی پیدا کی جائے۔

غبارے از ممتاز مفتی

انسان تھا ورنہ وہاں سے بھی شائد ہمیں نکال باہر کر دیا جاتا۔ بھلا وقت بے وقت کی محفلیں متصل خاتون خانہ کو متاثر کئے بغیر کیسے رہ سکتیں۔

تو صاحبو مفتوں سے ہوشیار ورنہ معاشی بدحالی سامنے کھڑی دانت نکوچار ہی ہے۔

ہمارے پٹھان معاشرے کی عشروں سے ایک روایت چلی آرہی تھی جواب مائل بہ معدومیت ہے کہ پٹھان نے جس جگہ کو آباد کیا، وہاں پہلے مسجد بنوائی پھر مٹی گارے کا حجرہ اور بعد میں گھر تعمیر کیا۔ اس روایت کی اصل وجہ پٹھانوں کی مہمان پسندی کے سوا کچھ نہیں۔ حجروں کے دروازے ہی نہیں ہوتے اور تھکے ماندے مسافر طعام و قیام سے فیضیاب ہوتے۔ بہت سے تجرد پسند مفتے تو آخری ہچکی تک (مالِ مفت دلِ بے رحم) روٹیاں توڑتے لیکن میزبان کے ماتھے پر بل کبھی نہیں آئے۔ ایسے بہت سے کردار بچپن میں اردگرد حجروں میں زیرِ مشاہدہ رہے پھر وقت کی دھول اُڑی اور ہماری عمر کے ساتھ ساتھ حجرہ بیٹھک تک سمٹ آیا، جس کی کنڈی بھی اندر ہی لگتی ہے اور گرد سے اٹ کر بھی کسی مہمان کی شکل نہیں دیکھی۔

حیرانی تب ہوئی جب پہلی تعیناتی پر مردان کے صوابی سرحدی گاؤں انار بیگ جانا پڑا جہاں پہلے سے میرے گاؤں والے محبّ علی دوست بطور پی۔ ای۔ ٹی تعینات تھے۔ خوشی ہوئی کہ چلو سکول میں رہنے کے لیے ساتھی میسر ہوا، اس لیے گھر سے چولہا بستر وغیرہ لے کر پہنچا اور ڈیوٹی شروع کر دی۔ کیونکہ روز آنا جانا کار دارد تھا۔ پہلی رات تو مہمانداری کی وجہ سے ساتھ رہا لیکن دوسری رات اس کے ساتھ ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ تمہیں کس نے کہا بستر لے کر آن دھمکو، چلو سیدھے سجاؤ حجرے کی طرف نہیں تو چولہا شولہا اور بستر پھنکوار رہا ہوں۔ بس اس دن کے بعد ہم تھے اور سبز علی خان۔ تب سے ایسی گہری دوستی ہوئی ہے کہ تاحال جاری وساری ہے۔

پہلے پہل یہ جھجک آڑے آتی رہی تھی کہ کما اپنا رہا ہوں اور مفتا بن کر ان بچارے زمینداروں کا کھا رہا ہوں۔ اس کے ہاں کھانا اگر چہ سادہ لیکن خلوص سے بھرا ہوتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اپنے گھر میں کبھی آلو کو منہ نہیں لگایا لیکن وہاں کلو کے حساب سے چٹ کر جاتا اس پر مہندی تندوری۔۔۔۔ واہ!

آٹھ مہینے مفتے بنے ہوئے وہاں پڑے رہے لیکن ان چھ بھائیوں مشر لالا عالم زیب، سبز علی، عالم زیب، حبیب، حسن زیب کی مہمانوازی مزید بڑھتی رہی بلکہ اب بھی ہے کیونکہ اب میرا چھوٹا بھائی وہاں مفتا بنا ہوا ہے۔ اس ایک حجرے نے مردان میں یہی روایت برقرار رکھی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے، کسی طمع لالچ یا غرض میں نہیں، محض محبت میں چار پانچ اساتذہ کو قیام وطعام کا یہ سلسلہ ابھی تک برقرار ہے۔ ابھی پرسوں ہی شیراز مشر لالا کے بیٹے کی شادی میں ہم چار رکنی سابقہ (مفتے) اساتذہ علی زمان، محبّ علی اور سلمان سالم بھینس کی بوٹیوں کا ذائقہ چکھ کر آ گئے ہیں۔ ان کے

ہاں روایت اس کے والد محترم کے وقت سے چلی آ رہی ہے۔

آج کل تو اُ ا ، اور ہوا خصوصاً فیس بک پر چل رہی ہے کہ بعض متشاعر تخلص بدل کر پورا کلام مفت سمجھ کر فخریہ اپنی دیواروں پر دیدہ دلیری سے ٹانگتے رہتے ہیں۔ اگر میری بات کا یقین نہیں تو سرچ کر لیجئے مختلف گوشوں میں اپنا کلام کسی اور کے نام سے دیکھ کر سر پکڑ کر رہ جائیں گے۔ سرقے کی یہ قسم بھی عجیب ہے کہ اصل تخلیق کار شور مچا کر بھی اپنے کلام سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے کہ حرمتِ قلم کا قانون ہی نہیں بنا اور اگر ہے بھی تو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔

تخلیق کار بچارا بھی سوائے دل جلانے کے اور کیا کر سکتا ہے کہ جس بھونڈے طریقے سے اس کا تخلص اڑا کر اپنا گھسیڑ دیتے ہیں کہ اصل تخلیق کار بے چارے کو بھی اس سرقے باز کی ذلیلانہ حرکت پر ٹھاہ ٹھاہ ہنسی آ جاتی ہے۔ ایسے مفتوں کے جھگڑوں سے فیس بک اٹا پڑا ہے۔

پرانے زمانے میں صرف ذوقِ سخن شاعروں پر راج کرتا تھا لیکن آج کل شہرت کی دیوی سوار ہے اور بعض تو تیلی گلی سے نمودار ہو کر مشاعروں کی جان بن جاتے ہیں۔ پھر اس کے نخرے بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہ بلا اجرت بلائے جانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اگر چہ سرقے پڑھ پڑھ کر داد سمیٹ لیتے ہیں اور سامعین و منتظمین مشاعرہ بھی کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر ان مفتوں کے مطالبات ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک بچاری درزن اپنے بچوں کا خرچہ اٹھانے کے لیے اپنی بیماری کی پرواہ کیے بنا روز کٹر کٹر کٹر مشین چلاتی ہے لیکن بعضے مفتے رشتہ دار تعلق کو بنیاد پر ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایسا ایک کردار میرے سامنے لاکھ بہانے کر کے جان چھڑاتی رہتی ہے لیکن مفتی (مفتے کی تانیث) دیدہ دلیر اتنی کہ دو تین جوڑے سلوا ہی لیتی ہیں۔ اب میں نے بھی اپنی بھابھی جو سالی بھی ہے، سے کہہ دیا ہے کہ قطعاً ایسے مفتوں کا کام نہ کریں۔ تعلق نبھائے تو ٹھیک نہ نبھائے تو بھاڑ میں جائے۔

ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو پودوں سے بہت محبت ہے اس سال بھی سو کے قریب انواع اقسام کے پودے چھ کنال اراضی والے سکول میں کچھ اپنے اور کچھ سرکاری شجرکاری مہم میں لگوا چکے ہیں۔ ایک حصہ جو بنجر تھا اس میں ساگ شلجم مولیاں لوبیا گوبھی اور دیگر سبزیاں لگوائیں۔ ابھی فصل پوری طرح تیار بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمارے محترم مفتے اساتذہ کرام شاپر بھر کے شاپر بھر کے گھروں کو بھجوا چکے، جیسے بازار میں اس کی قلت ہو گئی ہو۔ ہیڈ ماسٹر بچارے کے نصیبوں میں تو آٹے میں نمک کے برابر ہی آ سکا اور مفتے ڈھیٹ پن کی ریزگاری سے سب کچھ خرید کر لے گئے۔ ایسے ایسے مفتے سامنے آئے کہ جن کے نام یہاں بتانا باعثِ نقصِ امن ہے لیکن مفتے تو بہر حال خود کو پہچان ہی لیتے ہیں۔

ایک مفتا محض اس وجہ سے تعلق توڑ گیا کہ اس کے پرائیویٹ سکول میں دیواروں پر خطاطی کی بیگار نہیں کی۔ ہم نے بھی ایسوں سے دامن سمیٹ لیا ہے کہ کچھ دن قرض دے کر ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے گاڑی لے جاتا رہا جبکہ مستری خانوں میں بعد میں تن من دھن لیے خوار ہم ہوتے رہتے۔ اس پر طرہ یہ کہ موصوف نے دو لاکھ میں پچیس ہزار ادھار دے کر گاؤں میں مشہور کر رکھا تھا کہ یہ میری ہی گاڑی ہے حالانکہ جی پی فنڈ کے بقایا جات آج تک ہم اتار رہے ہیں، اس لیے اُسی فسادکی جڑ کو بیچ باچ کر سارے قرضے چکتا کئے اور اپنی جان چھڑائی۔ اب چوتھی گاڑی بہ فضل خدا خود میرے اپنے خون پسینے کو یخنی کی طرح پی کر پیدا ہوئی ہے۔ نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوند خوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ فنونِ لطیفہ سے خصوصی شغف رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں شاعری اور مضمون نگاری بھی ان کے ابلاغ کے ذرائع ہیں۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل کرم فرما ہیں اور اس کے پڑھنے والوں کے لئے ہر ماہ باقاعدگی سے مرچ مصالحے کا اہتمام کرتے ہیں۔

صفائی

نیاز محمود

پچھلے دنوں چند پرانی تصاویر ہاتھ لگیں۔ اُٹھا کے دیکھنے لگا تو یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ بچپن اور نوجوانی کی حسین یادیں مچل مچل کر ہاتھ کھڑا کرنے لگیں۔ اس دوران میری نظر اچانک اک تصویر پہ پڑی اور بے اختیار میری ہنسی نکل گئی۔ بات ہی ایسی تھی۔ کچھ تو تصویر پرانی تھی اور جگہ جگہ داغ پڑے تھے۔ کچھ داغ اصلی تھے جن کی گواہی تصویر میں ملبوس میرا لباس دے رہا تھا۔ چہرے کی معصومیت اور دامن پر لگے داغوں کا ایک دوسرے سے میل نہ کھانا ہی میری ہنسی کا بنیادی موجب بنا تھا۔ ذرا غور کیا تو تصویر میں دوسرے ساتھیوں کا حال بھی مجھ سے مختلف نہ تھا۔ ایک طرف کپڑوں پر لگی گندی، میل اور داغ، اور دوسری طرف معصومیت سے مزین چہرے۔ آہستہ آہستہ میں ماضی کی کتاب کے ورق گردانے لگا۔

مجھے یاد آیا کہ بچپن میں جب بھی بارش ہوتی ہم ننگے پاؤں ہی سکول جاتے۔ اکثر سکول پہنچتے ہی چھٹی دے کر واپس گھر بھیج دئے جاتے کیونکہ اکثر کمروں کی چھتیں ٹپکا کرتی تھیں۔ سکول میں واش روم وغیرہ کا کوئی تصور نہ تھا۔ چاردیواری کے نام سے تو اکثر سکول نابلد تھے۔ رفع حاجت کے لیے قریبی کھیتوں کا ہی رخ کرتے۔ گھروں سے تختیاں لکھ کے لاتے۔ ان کو سکول ہی میں موجود ایک چھوٹے سے جوہڑ نما جگہ پر دھوتے۔ اس جوہڑ میں تھوڑا سا پانی ہوتا جو انتہائی گدلا اور بدبودار ہوتا۔ کبھی کبھار ساتھ ہی موجود کنوئیں سے پانی نکال کر اس میں ڈالتے تاکہ سوکھنے نہ پائے۔ پینے کے لیے قریب ہی موجود مسجد سے پانی بھر لایا جاتا تھا۔ یہ کام سکول کے بڑے طلبہ شوق سے پورا کرتے۔

سبق سکھانے کے بعد اکثر اوقات استاد صاحب بچوں کے لیے قلم تراشتے۔ اسی قلم سے تختیاں لکھی جاتی تھیں۔ بستہ کیا ہوتا تھا، تختی، ایک سلیٹ، چند بڑی کتابیں اس کے اوپر ایک چھوٹے سے کپڑے میں بندے اک دو چھوٹی کتابیں اوپر سیاہی کی دوات۔ قلم کو دوات میں موجود سیاہی میں ڈبو کر تختی پر لکھا کرتے تھے جس سے سیاہی ہاتھوں پر بھی لگ جاتی تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ قلم سے سیاہی کپڑوں پر گر جاتی یا پھر ہاتھ بستے کے کپڑے سے پونچھ لیتے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لباس کے اگلے پچھلے دامن سے بھی ہاتھ پونچھ لیتے تھے۔ کئی کئی دن یہ لباس زیب تن رہتا۔

سکول میں کسی خاص یونیفارم کا رواج نہ تھا جو جس رنگ، ڈھنگ کا لباس چاہتا زیب تن کرسکتا تھا۔ یہی حال جوتوں کا بھی تھا۔ اول تو جوتے ہوتے ہی نہ تھے، اگر ہوتے بھی تو آج کی طرح روز روز پالش نہیں ہوتے تھے۔ ان دنوں جمعے کو سکول سے چھٹی

ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک دن چھٹی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ امی نے نہلایا، صاف کپڑے دیئے۔ بچپن میں بڑی مشکل سے نہانے پہ آمادہ ہوتا۔ امی زبردستی نہلاتی۔ میں بھاگ نہ جاؤں اور چپ کر کے کھڑا رہوں، امی اکثر میری آنکھوں میں صابن لگاتی۔ ان کا خیال ہوتا تھا کہ اس طرح میں جلن کی وجہ سے آنکھیں نہ کھول سکوں گا اور بھاگنے کی بجائے آرام سے کھڑے ہو کرا سے نہلانے دوں گا لیکن امی کو کیا پتہ تھا کہ میرا نہانے کے لیے آمادہ نہ ہونا تو دراصل صابن کی یہی جلن تھی۔ وہ سمجھتی تھیں کہ میں نہانا نہیں چاہتا جب کہ مجھے اصل مسئلہ تو آنکھوں پر صابن ملنے اور اس کا آنکھوں میں چلے جانے سے تھا۔ نہانے سے فارغ ہوا تو صاف کپڑے پہنائے اور ساتھ ہی پالش شدہ جوتے میرے سامنے رکھے۔ اس دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جوتے پہنے اور کسی لاٹ صاحب کی طرح گلی میں کبھی ادھر کبھی ادھر چکر کاٹنے لگا۔ دو تین قدم چل کے خود بخود میری آنکھیں پالش شدہ جوتوں کا دیدار کرنے لگتیں۔ یہ نظارہ میرے لیے بہت متاثر کن تھا اور میں بار بار اس سے محظوظ ہوتا۔ اس دن مجھے اپنے جوتوں پر بڑا ناز تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اب میرا دھیان اپنے کپڑوں اور جوتوں پر زیادہ لگنے لگا۔ اب روز مجھے صاف کپڑوں اور پالش شدہ جوتوں کی یاد ستانے لگی۔ یوں کچھ عرصہ بعد صاف ستھرا رہنا میری عادت بن گئی۔ اب ابو کے ساتھ مسجد جانا شروع کیا۔ نماز سیکھ لی۔ جب نماز قضا ہوتی دکھ ہوتا۔ ایک دن اکیلے مسجد چلے گئے مجھے تیار ہونے میں دیر لگی۔ جب میں مسجد جانے لگا تو راستے میں ہی ابو سے ملاقات ہوگئی اور گھر واپس آنا پڑا کیونکہ نماز باجماعت ہو چکی تھی۔ اس دن میں خوب رویا۔ اب یاد کرتا ہوں تو عجیب سی کیفیت ہوتی ہے۔

گندگی اور میلے پن سے صفائی ستھرائی کا سفر عجیب سا ہے۔ گو کہ دونوں کا ساتھ اس وقت بھی تھا اور اب بھی یہ ایک دوسرے کے ہم رکاب ہیں لیکن اب ان کی پوزیشن بدل گئی ہے۔ پہلے گندگی کی باہر کپڑوں سے دوستی تھی یعنی ظاہر گندہ تھا لیکن من صاف تھا۔ معصومیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اندر کا ماحول باہر کی نسبت صاف وشفاف تھا۔ اب ظاہر صاف شفاف ہے۔ کپڑے، جوتا، ماحول، ہاتھ، پاوں انتہائی صاف شفاف لیکن من۔۔۔ من میلا ہے۔۔۔ گدلا ہے، لالچ ہے، حرص ہے، بغض و کینہ ہے، نفرت ہے، عداوت ہے، بدگمانی ہے، جھوٹ ہے، مکروفریب ہے، دکھاوا ہے، حسد ہے، ہوس ہے۔۔۔ اب من پر کئی خوشنما داغ ہیں۔ کہیں یہ داغ دولت کی چاہت کے ہیں کہیں شہرت اور نمود و نمائش کے۔ کہیں ہوس اور خود غرضی نے نقش بنائے ہیں تو کہیں نفرت اور کینے نے۔ غرض من پورے کا پورا رنگ برنگے داغوں سے بھرا پڑا ہے۔

اب کپڑے روز تبدیل ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا داغ برداشت نہیں ہوتا۔ جوتوں پر گرد پڑے تو ماتھے پر شکنیں آ جاتی ہیں۔ ظاہر انتہائی صاف ستھرا، جب کہ من داغ دار۔ تب روکھی سوکھی اور بھوک پیاس میں بھی اللہ کا شکر اور اب ان گنت آسائشیں وسہولیات ہیں لیکن نہ سکون ہے نہ شکر کے دو بول ادا کرنے کے لیے وقت۔۔۔ سوچتا ہوں کون سی حالت اچھی ہے پہلے والی یا دوسری والی؟ صفائی کون سی احسن ہے ظاہر کی یا باطن کی؟ دین ودنیا کی خوبصورتی کس رخ پر ہیں؟

میں تو ٹھہرا ماضی پرست اپنے آباواجداد کی طرح، آپ کے سوچ کا پیمانہ کس طرف جھکا ہوا ہے؟ کیا آپ بھی میرے ساتھی ہیں یا پلٹ کر مخالف سمت میں روبہ سفر ہیں؟؟

نیاز محمود صاحب کا تعلق ''چھوٹا لاہور'' صوابی سے ہے۔ ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ سے ایم۔ فل کیا ہے، مقالے کا عنوان تھا ''قدرت اللہ شہاب کی نثر کے فنی محاسن''۔ ناردرن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی جاری ہے۔ درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ انشائیہ اور افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی ہے۔ طنز ومزاح سے بھی فطری رغبت ہے جو انہیں ''ارمغانِ ابتسام'' کی طرف لے آئی ہے۔ معاشرے کے عمومی موضوعات کو طنز ومزاح کی خصوصی عینک سے دیکھنا ان کی تحریر کا امتیازی نشان ہے۔

شافعہ خان

جائز شاعری

''جگر! بات سن۔۔۔''

''ہاں بول بھائی۔۔۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ ایوب سے مل ہی لیتا تو اچھا تھا۔۔۔۔ بلاوجہ کے بھرم دکھائے بھلے مانس کو!'' ساغر نے چرس سے بھری سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''میں تیری جگہ ہوتا تو ضرور جاتا ایک وقت کا اچھا کھانا ہی مل جاتا۔۔۔اور تجھے یہ چرس کہاں سے ملی؟'' جگر مرادآبادی نے للچائی نظروں سے ساغر صدیقی کے بھرے ہوئے سگریٹ کو دیکھ کر کہا۔

''سونگھ کر دیکھ اپنے ملک کی خوشبو آئے گی تجھے۔۔۔ پاکستان میں ایک ہی چیز تو خالص ملتی ہے۔'' جگر نے بڑی بے صبری سے سونگھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بالکل سچ کہا تو نے پر یہ دنیا سے لایا کون ہے؟''

''اپنی برادری کا تو نہیں پر ہے اپنے جیسا ہی۔۔۔ یہ چرس اس کے سوا کوئی اور لا بھی نہ سکتا تھا۔''

''ارے بھائی آخر ہے کون وہ؟''

''یوسفی اور کون۔۔۔ابھی حال ہی میں تو یہاں پہنچا ہے!''

''ہے کدھر وہ نا ہنجار؟''

''ایلیاء بھائی کو دنیا کا تازہ حال سنانے بیٹھا تھا۔۔۔ پتا ہے ایلیاء بھائی کے لیے کیا لایا ہے؟''

''کیا لایا ہے؟''

''جوؤں والی کنگھی۔۔۔ بڑے ہی خوش ہیں جون بھائی

۔۔۔ کہتے ہیں کاش دنیا میں بال کٹوا لیتا، اب کب تک کسی حجام کے مرنے کا انتظار کروں؟ خیر سے گھٹنوں کو چھو رہی ہیں اب تو زلفیں۔‘‘

عالمِ برزخ میں یہ فراغت کا وقت تھا۔۔۔

برزخ کی فصیل پر بیٹھے غالبؔ فردوس کی جانب سے آنے والی شراب کی بہتی نہر کی آواز کو حسرت سے سن رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ایلیاء نے کراچی سے سکھر تک کا راستہ تو دو پیک بتایا تھا مگر برزخ سے بہشت تک کا راستہ کتنے پیک کا ہوگا یہ نہیں بتایا۔

اُدھر ایلیاء کان میں چٹکلے پھونکتے یوسفی صاحب سے شدید پریشان تھے۔۔۔ جو جوؤں کی کنگھی تحفہ دے کر ایلیاء سے چپک گئے تھے۔۔۔ بڑی ہی چاپلوس صورت بنا کر کہہ رہے تھے ’’ایلیاء سرکار، ہمارے رخصت ہونے سے قبل محلے کا ایک حجام شدید علیل تھا۔۔۔ امید ہے جلد آن دھمکے گا اور ہمیں پہچان لے گا، ہم کچھ دے دلا کر آپ کی زلفیں ترشوا دیں گے۔‘‘

’’یہ برزخ ہے، دنیا نہیں، یہاں رشوت نہیں چلتی یوسفی۔۔۔ جو اعمال دنیا میں کیے ہوتے ہیں وہی اعمال برزخ میں ہمراہ ہوں گے۔‘‘ جون نے منہ بنا کر کہا۔

’’حضور میرا مطلب تھا کہ آپ کا گوشہ عافیت کچھ بہشت سے نزدیک ہے۔۔۔ ذرا دیر حوروں کی جھلک دکھا دیں گے بیچارے کو۔۔۔ حساب کے بعد تو پکا جہنم میں جانا ہے، بشیر حجام نے، ہر وقت ناچ گانا لگا کر لونڈوں کا مجمع لگائے رکھتا تھا۔۔۔ وہ تو کسی حور کی جھلک دیکھ کر ہی بال کاٹ دے گا۔‘‘

’’تم اپنی بات کرو میاں!‘‘ جون نے بے رخی سے کہا۔

’’ہم تو ساری زندگی ایک زوجہ کے بے مزا کھانے کھا کر صبر کر کے اُس کی تعریف کرتے رہے ہیں، اب ایک دو حوروں کا تو

حق بنتا ہے ہمارا!!'' یوسفی صاحب نے دانت نکالے۔
''ویسے سرکار آپ نے یہاں اچھی جگہ پر قبضہ کرلیا ہے۔۔۔ حوروں کی آمدورفت اس طرف زیادہ رہتی ہے۔۔۔ ایک آنچل ہی لہراتا نظر آجائے تو دل کو تسلی ہوجاتی ہے۔''
''شاعری یونہی نہیں ہوتی میاں۔۔۔ عشق کرنا پڑتا ہے۔۔۔ مرمر کے جینا پڑتا ہے۔۔۔ جی جی کے مرنا پڑتا ہے۔''
''تم لاہور کی تنگ گلیوں سے گر نکل آتے تو شاعر بن جاتے۔۔۔''
''سرکار آپ ہماری بے عزتی فرما رہے ہیں، ہم حساس طبیعت کے مالک ہیں تبھی آپ کی پریشانی سے نجات کے لیے کنگھی کا تحفہ لائے ہیں اور ہمارے پاس شیمپو بھی ہے، ہم آپ کو نہانے کے لیے مستعار دے سکتے ہیں۔''
''ارے رہنے دو یوسفی، سب پتا ہے یہ نوازشات ہم ہی پر کیوں ہورہی ہیں۔''

منتظر تو سب ہی ہیں نظاروں کے پس بدنام تو ہم ہیں

جون یوسفی صاحب کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آرہے تھے۔ یوسفی دلبرداشتہ سے ہوکر غالب کی طرف چل پڑے۔

دور سے نظر آتی پہاڑی پر بنے ایک آرام دہ گھر کی کھڑکی کھلی تھی۔ اندر اقبال کرسی پر بیٹھے محوِ مطالعہ تھے۔ تبھی اپنی شاگردہ کو آواز لگائی ''پروین۔۔۔ سنو نیک بخت لڑکی!''
''جی جی استادِ محترم!''
''ذرا حقے کے چلم میں کوئلے ہی سلگا دو، حقہ پی کر کچھ اشعار ہی لکھ لیں گے۔''
''جی اچھا۔۔۔ استادِ محترم آج آپ سے ایک سوال کرنا تھا۔۔۔''
''ہمہ تن گوش ہوں۔''
''وہ سامنے دور فصیل پر کچھ اہلِ قلم کا ڈیرہ ہے، حال کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔۔۔ دنیا میں بھی بیشتر شاعر بدحال اور بدنام ہیں، دوسری طرف ان کو سراہا بھی جاتا ہے۔۔۔ آخر شاعری جائز ہے کہ نہیں؟ بس اتنا بتادیجیے!!''
''اقبال نے سرد آہ بھری اور گویا ہوئے ؎

عشق قاتل سے بھی، مقتول سے ہمدردی بھی
یہ بتا کس سے محبت کی جزا مانگے گا ؟
سجدہ خالق کو بھی ، ابلیس سے یارانہ بھی
حشر میں کس سے عقیدت کا صلہ مانگے گا؟

''دیکھو بیٹی پروین۔۔۔ شاعر اور ادیب ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔۔۔ شاعر کے اندر عشق بستا ہے اور عشق خالصتاً خدائی صفت ہے اور جب خدا یہ وصف کسی بندے کے سینے میں اُتار دے تب وہ بندہ انتہائی خاص ہوجاتا ہے اور اُس پر لازم ہوجاتا ہے کہ اِس وصف کی حفاظت کرے اور اِس میں ملاوٹ ہرگز نہ کرے۔۔۔ یہ اللہ کے بندے جو یہاں مضطرب سے بھٹک رہے ہیں پس انہوں نے پینے پلانے جیسی شیطانی صفات عشق کی صفت میں ملاوٹ کردی تبھی یوں بے کل ہیں ورنہ شاعری کا نشہ انسان کو بے خود کرنے کے لیے کافی ہے۔۔۔ شاعری سراسر جائز ہے۔'' یہ کہتے کہتے اقبال وجد میں آکر کلام پڑھنے لگے ؎

کیوں زیا کار بنوں، سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں، محوِ غمِ دوش رہوں
نالہ بلبل کی سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟

پروین شاکر نے کھڑکی بند کردی۔
دور کہیں سے غالب اُس کھڑکی کو تک رہے تھے۔

شافعہ خان کا تعلق کراچی سے ہے۔ گو کہ لکھنے کا شوق بہت پرانا ہے مگر اس شوق کو فروغ دینے کا خیال حال ہی میں طاری ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح اور اصلاحی پہلو نمایاں ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں سادگی ، بیساختگی اور چلبلا پن نمایاں ہے۔ سیاحت سے گہری دلچسپی ہونے کے باعث شخصیت میں قدرت کی رنگینیوں کے عناصر بھی شامل ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' غالباً یہ ان کی دوسری تحریر ہے۔

محمد ایوب صابرؔ

سفید ہاتھی

ایک دفعہ ہم نے ایک ہاتھی سے پوچھا! ہاتھی رے ہاتھی تیری کون سی کل سیدھی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ میری کل کو چھوڑ دیں، اپنے کل کی فکر کریں۔ جس طرح آپ کا آج ہے اِس سے کل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اُس نے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ تمھارے ملک کا یہ حال ہے کہ ''ہاتھی چڑھے کو کتا کاٹے''میں نے ہاتھی سے کہا کہ اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو تم تو اِس طرح چنگھاڑ رہے ہو جیسے تم سفید ہاتھی ہو۔ ہم نے بھی کوئی ہاتھی دانت کا چوڑا نہیں پہن رکھا، ہاں یہ بات سچ ہے کہ ہم نے بہت سے سفید ہاتھی پال رکھے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم بار بار''سفید گھر''امداد مانگنے جاتے ہیں۔

اب اسٹیل مل کو ہی لیجیے پاکستان کا سب سے بڑا صنعتی یونٹ ہے اس کے باوجود برسوں سے خسارے میں چل رہے بلکہ رینگ رہا ہے۔ پاکستان اسٹیل مل ایک ایسا فراخدل ادارہ ہے جہاں پر کام نہ کرنے والوں کو بھی ''تن کھا'' ملتی ہے۔ برسوں سے ''من پسند''لوگ اسٹیل مل کا تن کھا رہے ہیں، اِس کے باوجود یہ ادارہ ختم ہی نہیں ہو رہا۔ ہمارے ایک درآمدی وزیرِ اعظم نے بڑی شان وشوکت سے کوشش کی تھی کہ اسکریپ کی قیمت پر ساری اسٹیل مل فروخت کر دی جائے لیکن کہیں سے معاملہ عدالت عظمیٰ کے نوٹس میں آ گیا۔ خواجہ خوامخواہ کا کہنا ہے کہ مشرف بہ اقتدار ٹولے کا زوال پاکستان اسٹیل مل سے ہی شروع ہوا تھا۔ وہ ٹولہ بھی کوئی معمولی افراد پر مشتمل نہیں تھا، وہ بھی اسٹیل کا سینہ اور پتھر کا جگر رکھتے ہیں۔ عدالت عظمیٰ کے سامنے وہ سب کاغذی کردار نظر آئے۔ بالآخر یہ معاملہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' ثابت ہوا۔

پاکستان ریلوے کی طرف سفر شروع کریں۔ وہ بھی کسی سفید ہاتھی سے کم نہیں ہے۔ ریل کی بوگیاں، پٹری اور پلیٹ فارم پر لگا پانی کا نلکا ابھی تک انگریز حکومت کی یاد دلاتے ہیں۔ ریلوے

ملازمین ریل ٹکٹ سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ ایک ہی ٹکٹ کو کئی مرتبہ اپنے ہاتھوں سے گزارتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ان پر ایک ٹکٹ کئی مرتبہ فروخت کرنے کا الزام لگا رہا ہوں۔ سابق دور میں ایک کھلنڈرے ''ایورگرین کنوارے'' نے وزارت کا سنبھالنے کے بعد کروڑوں روپے کی تزین وآرائش کے بعد شادی ٹرین سروس شروع کی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اب شادی ٹرین سروس شروع ہوئی ہے تو موصوف خود بھی شادی کا لڈو کھالیں گے لیکن نہ تو انہوں نے اپنی شادی کا کھایا اور نہ ٹرین سروس کامیاب ہوسکی۔ اب اُن کو شادی کا مشورہ وہی دے سکتا ہے جو ہاتھی کے ساتھ گنے چوسنے پر راضی ہوگا۔ پاکستان ریلوے کا سفید ہاتھی اپنی عزت ووقار اور بھرم کھونے کے باوجود اپنی ''کھوراک'' میں کمی نہیں آنے دے رہا۔

واپڈا کو سفید ہاتھی کہتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے کیونکہ ہاتھی کی ٹکر ہاتھی ہی سنبھالے ہے یا واپڈا کا بوجھ حکومت ہی اٹھا سکتی ہے۔ اب تو لوگ بجلی کو ''بے جلی'' کہنے لگے ہیں۔ بلب تو کسی وقت جلتا نہیں پھر یہ بجلی کیسے ہوسکتی ہے۔ حکومت بجلی کا شارٹ فال نکالنے کے لئے بہت فال نکال رہی ہے۔ اسی لئے ایک سابقہ حکومت نے رینٹل پاور کا منصوبہ بنایا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد ہی رینٹل پاور کی ''رین ٹل'' گئی تھی۔

۲۰۰۷ء سے آسٹریلیا میں ۲۸ مارچ کے دن eart hour منانے کا آغاز ہوا۔ اس دن ساری دنیا میں شام کے وقت ۸:۳۰ سے ۹:۳۰ تک ایک گھنٹہ کے لئے تمام غیر ضروری بتیاں اور دوسرے برقی آلات بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد زمین کے نام ایک گھنٹہ ہے۔ ہمارے ملک میں بھی علامتی طور پر ارتھ آور منایا جاتا ہے حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ ہمارے ہاں پہلے ہی شام کے وقت لوڈشیڈنگ کی وجہ سے بلاناغہ ارتھ آور منائے جاتے ہیں۔ ہم سے زیادہ زمین سے پیار کون کرے گا؟ ہم تو اُس وقت سے ارتھ آور منا رہے ہیں جب دنیا میں ارتھ آور پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

پی آئی اے کو کون سفید ہاتھی کہتا ہے۔ اِس کے بارے میں تو

یہی کہا جاسکتا ہے ''ہاتھی ہزار لٹے پھر بھی سوالاکھ ٹکے کا'' آج سے ۴۰ برس قبل اپنی ایئر لائن کا شمار دنیا کی ۱۰ بہترین ایئر لائنز میں ہوتا تھا۔ آج بھی اِس کا شمار دنیا کی ۱۰ خسارہ ترین ایئر لائنز میں ہوتا ہے۔ آپ نے سنا نہیں کچھ عرصہ قبل ایم ڈی نے یورپ جانے والی پروازوں کا روٹ تبدیل کر کے ایئر لائن کا خسارہ کم کرنے کا کوشش کی تھی۔ اس پر تمام پائلٹ سیخ پا ہوگئے کہ اگر اس نئے روٹ سے پرواز جائے گی تو اوور ٹائم کم ہوجائے گا۔ انہوں نے ہڑتال کر کے ایم ڈی کی چھٹی کرادی۔ اُس ایم ڈی نے ہاتھی کے منہ میں لکڑی پکڑانے کی کوشش کی تھی اور خود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ہمارے مالیاتی ادارے بھی سفید ہاتھی کے زمرے میں آتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بینک قرضے دینے کے بعد وصول کرنے کی بجائے معاف کر دیتے ہیں۔ بااثر افراد کا قرضہ معاف کر کے اُس کا بوجھ پورے ملک پر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہمارے ایک پڑوسی ملک میں بینک کی تجوری میں پڑے

کٹی پارٹی

شادی کے بعد کبھی کبھار ملنے والی سات آٹھ سہیلیوں نے طے کیا کہ آئندہ وہ سب مہینے میں ایک بار اکٹھی ایک جگہ پر ملا کریں گی، کسی کیفے ٹیریا میں۔۔۔ گھر پر یا کسی اور سپاٹ پر۔ اُن کی گیدرنگ کا نام "دکھ سکھ ملن پارٹی" تھا۔ اس سے پیشتر اُنہوں نے اپنی ملاقات کو عنوان دینے کے لئے کئی نام سوچے تھے۔ "ون ڈے پارٹی"۔۔۔ "سہیلی پارٹی"۔۔۔ "روبرو پارٹی" وغیرہ۔ آخر میں انہوں نے مشہورِ زمانہ "کٹی پارٹی" نام رکھ لیا تھا لیکن کچھ دنوں بعد اُنہیں یہ بات یکسر رد کرنا پڑا اور نیا نام رکھنا پڑا کیونکہ کسی مرد نے ان کی پارٹی کو "کُتی پارٹی" کہہ دیا تھا۔

کائنات بشیر، جرمنی

ہوئے کرنسی نوٹ دیمک کھا گئی ہے۔ اگر ہمارے بینک بھی "اشرافیہ" کو قرضہ نہ دیں تو کرنسی نوٹوں کو دیمک چاٹ جائے گی۔ ہمارے بینک افسران تو دیمک کے ڈر سے قرضے دیتے ہیں اور دیمک کے خوف سے واپس نہیں لیتے۔ قوم کی بنیادوں کو دیمک کھا جائے تو کوئی بات نہیں، کرنسی نوٹوں کو دیمک سے بچانا بے حد ضروری ہے۔

ایک خبر کے مطابق پچھلے دنوں جنوبی افریقہ کے پلانسرگ نیشنل پارک کے ستم ظریف ہاتھی نے اپنا پیٹ کھجانے کے لئے ایک کار کا انتخاب کیا جس سے کار کی تمام کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے، چاروں ٹائر پھٹ گئے اور گاڑی کی چھت دھنس گئی جبکہ کار میں بیٹھے افراد خوفزدہ ہو کر کانپتے رہے مگر زندہ بچ گئے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ جب کسی کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ اُسے کھجانے کے لئے کیا کیا طریقے تلاش کرتا ہے۔ جو لوگ وہاں سے گزر رہے تھے وہ یہی کہہ رہے تھے کہ یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ جس خوفناک انداز میں ہاتھی نے کار کو چاروں شانے چت کیا اس سے نہ صرف ہاتھی کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ کار کے اندر سوار افراد کی بے بسی کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ہاتھی نما افراد اپنا پیٹ بھر کر کمزوروں پر اسی طرح اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح اس کار میں موجود لوگ چیخ و پکار کر کے بالآخر چپ کر گئے اسی طرح ہمارے ہاں پِسا ہوا طبقہ چپ چاپ ظلم و زیادتی سہنے کے بعد زندگی کے سفر پر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ رواں دواں ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فیل بان نے اپنے ہاتھی سے اِس بے وقت اور بلا جواز کھجلی کی وجہ دریافت کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔

ہاتھی پر الزام ہے کہ اس کے کھانے اور دکھانے کے دانت الگ الگ ہوتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے جو لوگ ملکی دولت لوٹ کر بھی ملک و قوم سے ہمدردی کا دعوٰی کرتے ہیں انہوں نے یہ سب ہاتھی سے سیکھا ہے۔ میرے خیال میں اِن لوگوں اور ہاتھی میں بہت فرق ہے۔ ہاتھی اپنا پیٹ بھرنے کے لئے ۲۴ گھنٹوں میں ۱۶ گھنٹے کھاتا رہتا ہے جبکہ صاحبانِ اختیار وہی کام دو چار گھنٹوں میں کر لیتے ہیں۔ ہماری معیشت کا یہ حال ہے کہ ہاتھی نکل گیا دُم اٹکی رہ گئی ہے۔ اب یہ دُم کب تک اٹکی رہے گی کہیں ایسا نہ ہو کہ دُم کی وجہ سے ہمارا دَم اٹکنا شروع ہو جائے۔

اِس وقت قوم کو کسی ایسے فیل بان کی ضرورت ہے جو اِس سفید ہاتھی کو رشوت، اقرباء پروری، لاقانونیت اور جہالت کا چارہ کھلانے کے بجائے ایمان واتحاد اور تنظیم کی جانب مائل کرے اور سب سے پہلے اپنے آپ کو مثال کے طور پر پیش کرے ورنہ ہماری ہر ایک کل ٹیڑھی ہی رہے گی۔

محمد ایوب صابر کا تعلق سیالکوٹ سے ہے جبکہ گزشتہ ۲۷ سال سے دہران (سعودی عرب) کا پانی پی رہے ہیں، ہوٹل مینجمنٹ پیشہ ہے۔ ظرافت نگار، شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، تحقیقی مضمون نگار سبھی کچھ ہیں۔ غزلوں اور افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور کئی زیرِ اشاعت ہیں۔ دو فکاہیہ مضامین کے مجموعے "دریچۂ ظرافت" اور "نسخہ ہائے لطافت" بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مزید ایک مجموعہ "چشمۂ فکاہت" زیرِ اشاعت ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کو اُن کے مسلسل قلمی تعاون کا افتخار حاصل ہے۔

کائنات بشیر، جرمنی

ایک ڈائری

ایک عالم کی نظر، ایک زمانے کی زباں
تجھ سے دلکش تیرا افسانہ ہوا جاتا ہے

تحریر کو تم اس وقت قدر کی نگاہ سے دیکھو گے جب تم خود لکھنے لگو گے۔

میرا قلم سے تعلق تو شائد اسی وقت استوار ہو گیا تھا جب میں نے نصاب کے علاوہ ڈائری لکھنے کی ابتدا کی تھی۔ ڈائری کیا ہے؟ یہ تو بچپن میں والد صاحب کی ڈائری دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا۔ جس میں اقبال کی شاعری موجود تھی۔ لیکن تب ڈائری کو مزید سمجھنے کی عمر نہ تھی۔ اس لئے اس بات کو ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد اگلی ڈائری میں نے اپنی دو کزن پھپھو کی بیٹی اور تایا کی بیٹی کے ہاتھ میں دیکھی۔ جس میں وہ کچھ لکھتی تھیں ایک دوسرے کو پڑھاتی تھیں اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ میں اشتیاق بھری نظروں سے انھیں دیکھتی تھی۔ اور ان کی ڈائری پڑھنے کا خیال میرے اندر چٹکیاں کاٹتا تھا کہ یہ آخر ایسا کیا ڈائری کے اندر لکھتی ہیں جو انھیں مزہ دیتا ہے۔

لیکن اُنھوں نے نہ تو میرا تجسس دور کیا اور نہ ہی اپنی ڈائری پڑھنے کو دی۔ کیونکہ بقول ان کے میری یہ عمر نہ تھی۔ اور حقیقت یہی تھی کہ وہ دونوں مجھ سے کافی بڑی تھیں۔ اس وقت میں کوئی لیٹر لکھ لوں یا عرضی یہی میرے لئے بہت تھا۔ خیر ان کے اس شوق نے میرے تجسس کو خوب ہوا دے دی تھی۔ اور میں نے تب سے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ بڑی ہو کر میں بھی ڈائری لکھوں گی اور ان دونوں کو ہرگز نہیں دکھاؤں گی۔ دل میں شوق کے ساتھ یہ بغض بھی شائد پروان چڑھ رہا تھا۔

میں سوچتی تھی کہ شائد ڈائری لکھنے کی اک خاص عمر ہوتی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے مجھے احساس کروایا تھا اور جب وہ وقت آئے گا تو ڈائری اور قلم خود بخود میرے ہاتھ میں آ جائے گا۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ میں دوبارہ پڑھائی کی جانب مصروف ہو گئی۔ پڑھنے کا جنون کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا اور میرا پڑھنا بھی محدود نہ تھا۔ میں بچوں، بڑوں کے میگزین، مذہبی مواد، کچن ٹوٹکے، اخبار جہاں، تاریخی ناول، فلمی میگزین، سب پڑھنے لگی۔ بلکہ میری ایک خالہ کو بلھے شاہ کا کلام پڑھنے کا بہت دل کرتا تھا مگر وہ پنجابی پڑھنے سے جلد اکتا جاتیں تو میں نے جوڑ توڑ کر کے ان کے ساتھ پنجابی کے شعر پڑھنے بھی شروع کر دیئے۔۔۔ تو اتنے رنگین مطالعے سے ڈائری لکھنے کا مواد بھی ذہن میں کافی جمع ہوتا رہا۔

اور آخر کار وہ وقت بھی دبے قدموں آ ہی گیا، جس کا انتظار لاشعور تھا۔ میں کالج میں تھی جب پہلی ڈائری میرے ہاتھ میں آئی

اور میں نے اس پر اپنے شوق کے رنگ بکھیرنے شروع کیے۔ پسندیدہ اقتباس، کوئی شعر یا جملہ یا کوئی آنے والے دنوں کا پلان، اقوال زریں یا کسی ناول افسانے میں پڑھی اچھی بات اس طرح کی چیزیں ڈائری پر منتقل ہونے لگیں۔ اس وقت مجھے لگا کہ شائد دماغ اتنی معلومات اور انفارمیشن کا بوجھ نہ سہار پائے تو اسے ڈائری پر منتقل کر کے اس کا بوجھ تھوڑا ہلکا کر دینا چاہیئے۔ اوئی اللہ، یہ تو اب جا کر پتہ چلتا ہے کہ اصل دماغ تو صرف چار فیصد ہی ہم استعمال کر پاتے ہیں۔ اور باقی کا اللہ اللہ خیر صلا۔۔۔ استراحت فرماتا ہے۔

تو اس طرح میرا ڈائری لکھنے کا سفر شروع ہوا تھا۔ اور ڈائری لکھنا میرے لئے ایک اچھا خاصا مشغلہ بن گیا تھا۔ اور جب کبھی اپنی لکھی کوئی بات دوبارہ کبھی میں پڑھتی تو بھی مجھے بہت مزہ آتا۔ اور بھولنے والی بات بھی دوبارہ جگہ بنا لیتی۔ اس وقت میگزین کے علاوہ ڈائری بھی اچھا خاصا دل بہلاتی تھی۔ البتہ میں نے یہ ضرور نوٹ کیا تھا کہ لوگوں کے لئے ڈائری کسی مسٹری سے کم نہیں ہے۔ انھیں ڈائری کسی لو لیٹر سے کم نہیں لگتی۔ ان کا خیال ہے جو بات دوسروں کو بتائی نہ جا سکے وہی چھپا کر ڈائری میں لکھی جاتی ہے۔ اور غالباً عاشقی، معشوقی جیسی خرافات کو ڈائری میں جگہ ملتی ہے۔ لو کر لو گل۔۔۔۔ ایسے بے ادب لوگوں سے واقعی ڈائری چھپا کر ہی رکھنی چاہیئے۔

پھر میں نے اپنے اردگرد کے لوگوں میں بھی اس پاکٹ بک کی اہمیت جاننی چاہی تو دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زندگی میں اس کی خاصی اہمیت ہے۔ ڈائری لکھنا ان کی روزمرہ کی ایک عادت ہے جب تک پورا نہ کر لیں۔ وہ اک کمی پاتے ہیں۔ کچھ مہربانوں نے بتایا کہ وہ ڈائری میں اپنی روزمرہ کی روٹین لکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس میں ماضی کی یادداشتیں مرتب کرتے۔ بھء مستقبل کی پلاننگ تو سمجھ میں آتی ہے مگر جو دن بیت گیا سو بیت گیا، اب اس کے لکھنے کی کیا ضرورت اور لکیر پیٹنے سے فائدہ؟

زندگی میں کچھ وقت ایسا بھی آیا کہ میں ڈائری لکھنے سے کچھ دور ہو گئی۔ مگر اچانک ہی ایک دن میرے دل نے سرگوشی کی۔ کیا ڈائری لکھنا بھول گئی؟ تو مجھے دوبارہ قلم اور کاغذ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اس بار ایک آن لائن ڈائری بلاگ کی صورت میرے سامنے تھی۔ جس پر لکھنا میرے لئے ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ اس ڈیجیٹل ڈائری پر لکھنا اور دوسروں کو پڑھانا اور ان کی رائے جاننا ایک نیا، انوکھا سلسلہ تھا۔

اب مجھے اپنے ساتھ ساتھ باقی لوگوں کی ڈائری پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ اب کسی نے بھی مجھ سے اپنی ڈائری نہیں چھپائی۔ اور لوگ اپنی ڈائری میں کیا لکھتے ہیں۔ یہ بات جاننا بھی میرے لئے دلچسپی کا باعث بنی۔ پھر ڈائری کی آڑ میں مجھے لکھنے والے کی شخصیت کی بھی جھلک ملنے لگی۔ اور بآسانی اب ہم دوسروں کی بھی ڈیجیٹل ڈائریاں آن لائن پڑھ سکتے ہیں۔ اب تو ہر کوئی فراخ دلی سے اسے پڑھنے کی آفر دیتا ہے۔ اور اس کے لئے اپنی ڈائری کو خوبصورتی کا پیرہن دیتا ہے۔ اپنے جذبات و احساسات کو بڑے پیار سے اس کے صفحہ قرطاس پر اتارتا ہے۔ خوبصورت عنوان اور رنگوں کی دھنک بکھیر کر اہل ذوق کو متوجہ کرتا ہے۔ صاحب بلاگ کو اگر شاعری کی آمد ہوتی ہے یا نثر کی، تو یہ آن لائن ڈائری اس کے اظہار خیال کے لئے ایک بہت عمدہ ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

مزے کی بات ہے کہ اب یہ ڈائریاں کسی کونے میں پڑی بوسیدہ بھی نہیں ہوتیں۔ دن رات آنکھوں کے سامنے آن لائن گھومتی رہتی ہیں۔ تو دوستو اس وقت بھی میرے اردگرد بہت سی ڈیجیٹل ڈائریاں بکھری ہوئی ہیں۔ جن سے میری بخوبی پہچان ہے جیسے،

منہ پھٹ ڈائری

لوگ کیا کہیں گے۔۔۔۔

اس کے لکھنے والوں کو اس بات کی بالکل پرواہ نہیں کہ لوگ ان کے لکھنے یا ان کی شخصیت کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ انھیں بس اپنی بات ہر صورت لکھنی ہے اور پڑھنے والوں تک پہنچانی ہے۔ بات چاہے مذہبی نکتے کی ہو یا کوئی اور، پھر چاہے وہاں کمنٹ کرنے والوں کا آپس میں ڈنڈا چلے یا سر پھٹول ہو۔ یہ لکھ کر غائب بھی ہو سکتے ہیں۔

شاعری ڈائری

یہ ڈائری بہت عام ہے اور بہت نازک مزاج ہے پھر بھی اس کی بہتات ہے۔ جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ شاعر کا انتخاب وجد کے عالم میں پیش کرتی ہے اور پڑھنے والوں کو بھی جھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ بہت سے حضرات کی پسندیدہ ڈائری ہے۔۔۔ کیونکہ اس پر لکھتے لکھتے صاحب بلاگ کو بھی آمد ہونے لگتی ہے۔۔۔ ہے ناں جادوئی ڈائری۔

سیاسی ڈائری

نام سے ہی ظاہر ہے۔۔۔ اس میں سے حالات حاضرہ کی خبریں نکلتی ہیں۔ سیاستدانوں اور لیڈروں کو چٹخنی دینے کے لیے یہ بہت کارآمد ہے۔ اور ملک میں الیکشن، مہنگائی، بین الاقوامی قرضہ اور ڈرون حملے اس کے خاص ابواب ہیں۔

مذہبی ڈائری

دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت۔۔۔ اس کے لکھنے والے بس اپنی رائے اپنی معلومات کو ہی فوقیت دیتے ہیں۔ راگ رنگ اور گانے سننے والے خاص طور پر ان کی تنقید کا نشانہ بنتے ہیں اور انھیں ان کی نصیحت بھی سنی پڑتی ہے۔ مگر پھر بھی وہ کرتے اپنے دل کی ہیں۔ اور روح کی غذا کے لئے گانے سننے سے باز نہیں آنے والے۔

محب الوطنی ڈائری

جب چودہ اگست، چھ ستمبر، اور بابائے قوم کی سالگرہ، برسی، اقبال ڈے آتا ہے تو یہ بھی متحرک ہو جاتی ہے۔ خود بھی محب وطنی سے معمور ہوتی ہے اور باقیوں کو بھی دو چار ترانے سنا کے جاتی ہے۔

مشاہدہ ڈائری

یہ ڈائری بھی بہت سے لوگوں کے پاس ہے۔ جو اردگرد والی دنیا پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ کہ کون کب چھلکے سے پھسل جائے یا کسی میاں بیوی ان بن ہو جائے یا کسی کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنس جائے تو وہ فوراً اسے کہانی افسانہ کا روپ دے کر دوسروں تک پہنچائیں۔

یادوں کی ڈائری

اس ڈائری کے لکھنے والے تو بچپن یا ابتدائے جوانی کے دور سے ہی باہر نہیں نکلنا چاہتے۔ ان کی ڈائری ایسی ہی یادگار ماضی کی رنگین یادداشتوں سے سجی ہوتی ہے۔ جسے وہ بار بار کھول کر پڑھتے ہیں۔ آسمان کو شکایتی نظروں سے تکتے ہیں اک آہ بھرتے ہیں اور دوسروں کو حال دل سناتے ہیں۔

تہواری ڈائری

یہ کچھ اہم تہواروں پر کھلتی ہے۔ دونوں عیدوں، شب برات، شب معراج وغیرہ پر شکر ہے یہ ہولی، دیوالی پر نہیں کھلتی۔ ورنہ یہ سب کو رنگوں میں نہلا کے جاتی اور دیوالی کے دیئے بھی جلاتی جاتی۔ دیا جلاؤ دیا جلاؤ جگمگ جگمگ دیا جلاؤ،

سدا بہار ڈائری

ٹھیک سمجھے۔۔۔ یہ ڈائری آئے دن کھلی رہتی ہے۔ کسی مہینے بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا۔ سالگرہ کا کیک اور تحفہ یاد دلانے آتی ہے۔ پھر دوسرے ساتھی بھی آ کر رسم دنیا داری نبھاتے ہیں۔ اور سالگرہ کے گیت الاپ کر اور کیک کھا کر رخصت ہوتے ہیں۔

ڈائری کو اپنا راز دار بناتے بناتے میں تو ان سب اہل ذوق کے شوق کو جان گئی ہوں۔ اور آپ کیا سوچ رہے ہیں اگر آپ نے کبھی ڈائری نہیں لکھی تو دیر مت کیجیے۔ یہ تجربہ بھی کر دیکھیے۔ کیونکہ، ایک دلچسپ ڈائری ایک دوست کی مانند ساتھ دیتی ہے۔

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری اِن کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری ان کی تحریر کا خاصا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں ان کی کتاب ''چاند اور صحرا'' شائع ہوئی (یہ مضمون اسی کتاب سے لیا گیا ہے)، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

قندِ شیریں

حافظ مظفر محسنؔ

بڑے آدمیوں کی چھوٹی باتیں

وہ گاڑی کے نیچے گھستا چلا جا رہا تھا۔ میں بھی اپنے کوٹ پتلون کی پروا کیے بغیر اُس کے ساتھ ہی گاڑی کے نیچے جا گھسا؟

''باؤ۔۔۔ تیرا تجربہ تو مجھ سے بھی زیادہ لگتا ہے۔۔۔ پروفیسری سے پہلے لگتا ہے تو بھی اس کام میں ''ملوث'' تھا؟''

''ملوث''۔۔۔ملوث؟'' میرے منہ سے نکلا۔

میری ہنسی نکل گئی۔ میں جلدی سے باہر آ گیا۔ وہ بھی فوراً گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔

''ناراض ہو گئے ہو کیا؟'' میں نے مکینک سے پوچھا۔

''نہیں جی۔۔۔ آؤ چائے پیتے ہیں۔'' اُس نے کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

''اوہ۔۔۔ چھوٹے ستائیس نمبر پہ۔ جو پرسوں نئی بیکری کھلی ہے وہاں سے دو کیک، آٹھ پیزے لے کے آ۔''

اُس نے آرڈر دیا اور کرسی کا رُخ میری طرف موڑ لیا۔

''مستری جی۔۔۔ یہ ''ملوث'' کا لفظ آپ نے غلط جگہ استعمال نہیں کیا۔''

وہ مسکرا دیا اور ہنستے ہوئے بولا ''پروفیسر صاحب نہ اسکول کا منہ دیکھا نہ تعلیم سے تعلق جوڑا ''ٹپ'' سے سٹارٹ لیا پھر نوٹ ہی

نوٹ۔۔۔اُس نے دراز سے بڑا پان نکالا، منہ میں ڈالا۔ دو چار بڑی بڑی اپنے ملازم لڑکوں کو گالیاں دیں۔ ایک دو لڑکے سگریٹ بجھاتے گاڑیوں کے نیچے گھس گئے۔ باقی کھڑے گپیں ہانکتے رہے۔ وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ (یہاں ماحول خاصا عوامی سا تھا)۔

''پروفیسر صاحب کتنی تنخواہ ہے خیر سے آپ کی چالیس سال بچوں کو پڑھانے کے بعد۔'' اُس نے مذاقیہ انداز میں پوچھا۔

''مستری تیری دو دن کی کمائی کے برابر ہوگی!''

وہ زور سے ہنسا۔ آدھا پان اُس کے منہ سے گر گیا، کچھ چھینٹیں اِدھر اُدھر گرے۔ (میں دور ہی بیٹھتا ہوں پان کھانے والوں سے اُن کے ''شر'' سے بچنا ہی بہتر ہے)۔

''باؤ۔۔۔ایک دن کی کمائی کے برابر ہوگی۔'' اُس نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔پھر خود ہی بولا ''جس دن کسی کا انجن کھل جائے سمجھو ہماری قسمت کھل گئی۔۔۔ایک دن کی ''انکم''۔۔۔

میرا سر ہلکا سا چکرایا۔۔۔ ذہن بھی سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے کہیں گم ہو گیا۔

''مجھے یہ دوسرا ''سچا'' آدمی ملا تھا۔۔۔اس سے پہلے میری لاہور کی ایک بڑے سنیارے سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں ہر سال سردیوں میں ''فیش پارٹی'' پہ بلاتا ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں کہا ''علاؤالدین صاحب آپ اللہ کا شکر ادا کیا کریں اُس نے آپ کو کروڑ پتی بنایا!''

''نہیں مظفر صاحب۔۔۔ارب پتی!!'' علاؤالدین صاحب نے میرے فقرے کی correction کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

مجھے اپنی ڈگریوں پر شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ ''مستری'' بھی ان پڑھ ہے اور علاؤالدین سنیارہ بھی ان پڑھ۔۔۔لیکن دونوں میں ''ریا کاری'' نہیں۔ دونوں نے اُس معاملے یعنی اپنی ''انکم'' کے بارے میں سچ بولا جبکہ اکثر لوگ اپنی دولت اور انکم بہت کم بتاتے ہیں، کماتے ہیں ''دو بئی'' لے جاتے ہیں ''پانامہ لیکس'' کل کے جلسے میں ''خان'' نے زور میاں صاحب پر رکھا نہ پیپلز پارٹی کو چھیڑا نہ ہی ''رحمان ملک'' یا ''اپنے'' علیم خان کی بات کی ہے۔۔۔ ناں انصاف کے اصولوں کے عین مطابق ''خان'' کا تہلکہ خیز خطاب؟

میں نے آدھا پیٹریز کھایا اور ایک کیک کا پیس لیا مگر مستری نے ایک پورا کیک اور پانچ پیٹریز ''رگڑے'' اور پھر سے منہ میں ''بڑا'' پان ڈال لیا۔ انگوٹھے کی مدد کے ساتھ منہ میں دھکیلتے ہوئے (یہ منظر صرف دیکھنے سے ہی بندہ انجوائے کرسکتا ہے، بیان کرنے سے مزہ نہیں آئے گا)۔

''مستری شہزادے۔۔۔ چائے ہوگئی اب جس محبت سے تم نے مجھے چائے پلائی ہے اُسی محبت سے میری گاڑی کا کام بھی کر دو یا میں گاڑی چھوڑ جاتا ہوں تسلی سے کر دیں سارا کام میں شام کو لے جاؤں گا۔۔۔ مجھے رکشہ منگوا دو میں کالج کا چکر لگا آؤں۔''

''ہاتھ نکال!'' مستری نے کہا۔

میں نے ہاتھ باہر نکالا۔ اُس نے زور سے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''پروفیسر شہزادے! تیرا کام ہو چکا ہے صرف نیچے اِک ''نٹ'' کو ''بولڈ'' میں ٹھیک سے کس لگانی تھی۔۔۔وہ تو جب میں گاڑی کے نیچے گھسا ہی تھا، لگا دی تھی۔۔۔ سب کام ''ٹچ'' ہو چکا ہے۔۔۔آپ شریف آدمی ہیں اور ''معمولی'' انکم میں گزارا کرتے ہیں اس لیے یہ کام ''فری'' ورنہ کوئی سرکاری آفیسر کی بیگم صاحبہ ہوتی تو ''انجن کا کام ہوگا'' کہہ کے ہم نے بیگم صاحبہ کو رخصت کر دینا تھا اور دو دن بعد ''نٹ'' کو کس لگانے کے ہم نے اسی ہزار لے لینے تھے۔۔۔ نئے پرزے (پارٹس) ڈالنے اور کمپیوٹر چیک کی فیس چار ہزار علیحدہ!''

''تو مستری جب بیگم صاحبہ گاڑی کھڑی کر جاتی ہیں دو دن کے لیے جس کا آپ نے تیسرے دن دو لاکھ تقریباً کمانا ہوتا ہے اک ''نٹ'' کس کے۔۔۔دو دن وہ گاڑی پھر اِدھر ہی کھڑی رہتی ہے۔''

''اوہ! نہیں بھولے بادشاہ۔۔۔ اُس چم چم کرتی نئی نویلی

''کمپاؤنڈ'' ماری۔۔۔ گاڑی پر یہ ہمارے لڑکے ''ڈیٹ'' مارنے نکل جاتے ہیں۔۔۔ لنڈے سے خریدی ''جین اور اپر'' پہن کے۔۔۔ ان کے پاس بھی موبائل فون ہیں ان لڑکوں نے بھی facebook پہ آئی۔ڈی بنا رکھی ہے۔۔۔ آئی سمجھ؟'' وہ بولا۔

''کہو تو آپ کو request بھیجوں؟''

''اور فیشن ایبل کالجوں کی لڑکیاں سمجھتی ہیں یہ گاڑی اس ''شوخے'' کی اپنی ہے؟''

''ہاں ہاں۔۔۔ ہاں!!'' وہ اپنے بائیں ہاتھ پہ دائیاں ہاتھ مارتے ہوئے خوب ہنسا۔

''اچھا مستری جی۔۔۔ چلتا ہوں۔۔۔ میرا دماغ نہ کہیں خراب ہو جائے آپ کی ''بڑی بڑی'' سن کے۔۔۔''

''باتیں۔'' اُس نے میرا فقرہ مکمل کرتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر سے مجھے کرسی پیش کر کے بیٹھنے کو کہا۔

تمہیں تمہاری بھتیجی سے ملواتا ہے پروفیسر۔۔۔ وہ آرہی ہے۔۔۔ وہ پڑھنے لکھنے کی شوقین ہے۔''

ایک لمبی گاڑی آکر رُکی۔ ایک باپردہ لڑکی چابی گھماتی ہمارے پاس آکر رُکی، نہایت ادب سے جھک کر دھیمے لہجے میں اُس نے سلام کیا۔

''بیٹی بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کرسی پیش کی۔

''نہیں سر میں اپنے اساتذہ کے سامنے کرسی پر نہیں بیٹھتی۔۔۔ یہ میری ماں نے مجھے سمجھا رکھا ہے۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ مستری کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''پروفیسر صاحب۔۔۔ تہجد گزار ہے زینب۔۔۔ ماں کے ساتھ تہجد پڑھتی ہے۔۔۔ پھر اپنی کتابیں کھولتی ہے۔۔۔ فجر کی نماز تک یہ پڑھتی ہے اور اس کی ماں تسبیح کرتی رہتی ہے۔۔۔ اس کے میٹرک میں ۱۰۶۲ نمبر آئے ہیں۔ پروفیسر ''اُس'' کی سُن۔۔۔ اُس نے سو غریب عورتوں کا ہر مہینے ''وظیفہ'' لگا رکھا ہے۔ پروفیسر میں دنیا میں صرف ''اُس'' سے ڈرتا ہوں۔''

''سر میں نے پانچوں subject کی ٹیوشن پڑھنی ہے۔۔۔ میں کالج میں بھی ''ٹھیک'' ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ کوئی کسر میری طرف سے نہ رہے۔۔۔ میں آٹو موبائل میں انجینئرنگ کرنا چاہتی ہوں اور اپنے پاپا کا یہ کاروبار سمجھنا چاہتی ہوں تاکہ اُن ''سو خواتین'' کا وظیفہ بند نہ ہو جائے کیونکہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے اور مجھے اپنے باپ کو بیٹی ہوتے ہوئے ''بیٹا'' بھی تو بن کے دکھانا ہے!''

''بیٹا۔۔۔ میں ایک subject کے پانچ ہزار اپنی اکیڈمی میں لیتا ہوں آپ کے پانچ مضامین ہیں آپ کے پچیس ہزار بنے۔۔۔ مستری چونکہ میرا دوست بن گیا ہے اس لیے آپ کے لیے خصوصی رعایت کل پانچ مضامین کے بیس ہزار!!''

اوہ۔۔۔ تو پروفیسر۔۔۔ میں تیرے پانچ مضمون پڑھانے کے پچیس نہیں تیس ہزار دوں گا۔۔۔ ہم یار مار نہیں، یاروں کے یار ہیں۔'' وہ محبت سے بولا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

وہ پھر میرے پاس آیا۔ ''پروفیسر ایک بچے کے پانچ مضامین پڑھانے کے پچیس ہزار روپے مہینہ لیتے ہو۔۔۔ تمہاری اکیڈمی میں کل کتنے لڑکے ہیں؟'' اُس نے محبت سے پوچھا۔

''گیارہ سو!'' میں نے سادگی سے بتایا۔

''ہائیں۔۔۔''

گاڑی چل چکی تھی۔ میں نے دیکھا، مستری کے طوطے اڑ چکے تھے اور FM پر گل بہار بانو کی یہ غزل چل رہی تھی ؎

ہمیں جہاں میں کوئی صاحبِ نظر نہ ملا

حافظ مظفر محسنؔ صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

قندِ شیریں

خادم حسین مجاہدؔ

ملفوظاتِ گفتار غازی

حضرت کو عوام کالانعام یعنی اندھے معتقدین کی طرف سے بے تحاشہ مالِ مفت میں، نذرانوں کے علاوہ قسم قسم کی سوغاتیں، شیرینی اور بکرا جات وغیرہ بھی وافر مقدار میں ملا کرتے تھے، جنہیں وہ دلِ بے رحم کی طرح ہی استعمال کرتے تھے اور ہل جل کر تو کبھی کچھ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ایک تو وہ خود ہی معقول حد تک سست اور کاہل الوجود تھے، دوسرے ان کے مفت کے خدمت گذاروں یعنی مریدین نے ان کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی ان کی زندگی کا چہلم یعنی چالیسواں ہوا، ذیابیطس ان کے گوڈے گٹوں میں بیٹھ گئی۔ اوّل اوّل تو اُنہوں نے اسے بالکل بھی اہمیت نہیں دی لیکن جب شوگر نے اپنا آپ دکھایا تو اُنہوں نے دوا اور بادلِ نخواستہ کسی حد تک پرہیز شروع کردی۔ پھر بھی ان کو شوگر کے ساتھ مانوس ہوتے ہوتے دس سال لگ گئے لیکن شوگر کے ساتھ ان کے کبھی بھی مفاہمانہ تعلقات قائم نہ ہو سکے اور شوگر کی وجہ سے ہی گردے ختم ہونے کے باعث انہوں نے محض ساٹھ سال کی عمر میں ہی ملک الموت سے ملاقات کرلی مگر چالیس سال کی عمر کے بعد سے وہ ہمیشہ شوگر سے ویسے ہی شاکی رہے جیسے بیس سال کی عمر میں شادی ہونے کے بعد بیوی سے۔

راہیٔ ملک عدم ہونے سے چند سال پیشتر ایک بار جب وہ محفل آراء تھے، کسی نے بیماریوں اور ان کی اذیت ناکی کا ذکر چھیڑ دیا تو وہ جیسے بھرے بیٹھے تھے، فوراً بولے کہ بیماری تو کوئی بھی اچھی نہیں لیکن جب سے مجھے شوگر ہوئی ہے دوسری بیماریاں نعمت لگنے لگی ہیں۔ یہ تو ایسا ذلیل مرض ہے جو اپنے مریض پر اتنی پابندیاں لگا دیتا ہے کہ وہ آزاد ہوتے ہوئے بھی خود کو جیل میں محسوس کرتا ہے۔ پتا چلے کہ آٹا دال کا بھاؤ کیا ہوتا ہے۔ یوں تو ہر انسان کی زندگی کم از کم ایک بار ضرور بدلتی ہے جب اس کی شادی ہوتی ہے لیکن ذیابیطس کے مریضوں کی زندگی دو بار بدلتی ہے۔ ایک بار شادی کے بعد اور دوسری بار شوگر ہونے کے بعد، شادی کے بعد انسان کے جگری یار چھوٹ جاتے ہیں اور شوگر کے بعد پسندیدہ غذائیں۔ اس کی زندگی سے تو مٹھاس ختم ہوتی ہی ہے۔ کتنی ہی حلال چیزیں بھی اس پر حرام ہو جاتی ہیں جو پہلے انگنت اور بے تحاشا کھاتے تھے۔

شوگر کے بعد ہر چیز حرارے معلوم کرکے اور گن گن کر لی جاتی ہے اور اگر ذرا سی بھی زیادتی ہو جائے تو ٹائکٹ پریڈ میں تو اضافہ

ہوتا ہی ہے، سر اور جوڑوں میں درد بھی شروع ہوجاتا ہے اور اگر کوئی دعوت اڑائی جائے یا کوئی تگڑی غذا کھالی جائے تو معدہ بغاوت کردیتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ورزش کر کے اسے ٹھکانے لگانا پڑتا ہے۔ دنیا میں شوگر سے بڑھ کے بھی خطرناک بیماریاں ہیں مگر جتنی پابندیاں شوگر کی ہیں، کسی اور بیماری میں نہیں اور اگر یہ پابندیاں نہ کی جائیں تو کتنی ہی بیماریاں مزید ہوجاتی ہیں، مثلاً موتیا، ہیپاٹائٹس، بواسیر بلڈ پریشر، قبض، دل جگر اور گردوں کے امراض یعنی ام الامراض قبض نہیں بلکہ ذیابیطس ہے کیونکہ قبض کی ایک وجہ شوگر بھی ہے اور اگر شوگر شروع ہوجائے تو سمجھ لیں کہ باقی بیماریاں بھی حملہ کرنے کے لئے لائن میں لگ گئی ہیں، اس لئے موت کے سوا بچنے کی کوئی شکل نہیں کیونکہ جو دوا ہے وہ یوں نہیں کہ ایک بار لے لی اور بات ختم، بلکہ روٹی آپ کھائیں نہ کھائیں لیکن دوا نہ کھائیں تو خیر نہیں۔

اگرچہ فراڈئے یہاں بھی فراڈ کرنے سے باز نہیں آتے اور چند خوراکوں میں ہی چند پھونکوں میں شوگر کے مکمل اور حتمی علاج کے دعوؤں کے ساتھ عوام الناس کو لوٹ کر دوائی سے مکمل چھٹکارے کا مژدہ سناتے ہیں اور دوا چھوڑنے کے کچھ روز بعد جب مریض کی حالت غیر ہوتی ہے تو ٹیسٹ کرانے پہ پتہ چلتا ہے کہ شوگر اور بڑھ گئی پھر اگر کوئی مرنے سے بچ جائے تو دوا اور پرہیز میں اور اضافہ ہوجاتا ہے

عجیب بات یہ ہے کہ انسان کو جو چیز منع ہوتی ہے اس کے لئے ہی دل زیادہ چاہتا ہے اور چاہے پہلے پسند نہ بھی ہو شوگر کے بعد بندہ مٹھائی کھانے سے باز نہیں آتا۔ حالانکہ یہ صاحب عقل و شعور مخلوق ہے اس کے برعکس بے شعور مخلوق پر ریسرچ ثابت کرتی ہے کہ جانوروں کے لئے جو چیز مضر ہوتی ہے وہ اس کے کھانے سے باز رہتے ہیں یا ان میں اس کی خواہش ہی ختم ہوجاتی ہے یعنی جو جو ابدہ ہے اسے ہی آزادی ہے اپنا بیڑہ غرق کرنے کی۔ ویسے تو شوگر کے مریضوں کو ہر وقت ہی کچھ نہ کچھ کھانے کی ہدایت ہے مگر صرف وہ چیزیں جن کو بندہ اپنی خوشی سے کبھی نہ کھائے۔

ایک گھوڑوں کی خوارک چنے ہی ہیں، جو شوگر کے مریض بے دھڑک کھا سکتے ہیں جس میں شوگر بھی نہیں اور طاقت بھی ہے ورنہ ہر طاقت والی چیز میں شوگر زیادہ ہوتی ہے، پہلے حکیم ذیابیطس کے مریضوں کو چینی منع کرتے تھے اور گڑ کی اجازت دے دیتے تھے مگر اب ڈاکٹروں نے وہ بھی منع کردیا ہے۔ اب لے دے کہ شوگر فری مصنوعات رہ جاتی ہیں جن کے استعمال پر شوگر کے مریضوں کا گزارا ہے لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ جوڑ ہلا دیتی ہیں اب بندہ جائے تو کہاں جائے۔

ایک مرید نے پوچھا کہ حضرت یہ مرض واہیات اور ہیبت ناک ہوتا کیسے ہے؟ تو حضرت نے فرمایا ''اِس کی وجوہات ایک سے زیادہ ہیں وراثت، موٹاپا، گردوں کی کمزوری اور ٹینشن اس کی اہم وجوہات ہیں اور جو لوگ ہر وقت اپنی یا دوسروں کی بیویوں کے حقوق ادا کرتے رہتے ہیں، اُن کو بھی گردوں کی کمزوری کے باعث یہ مرض گرا دیتا ہے اور پھر یہ دوسروں کی کیا، اپنی بیوی کے حقوق بھی کبھی کبھار ہی ادا کرنے کے قابل رہ جاتے ہیں اور وہ بھی صرف ڈیوٹی پوری کرنے کی حد تک۔ ابتدائی جوش و جذبہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہے کہ انہیں اپنی یا کسی اور کی زوجہ مشکوک نظروں سے دیکھے تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں شوگر اچھے خاصے جوان مرد کو تقریباً نامرد بنا دیتی ہے اور بڑے بڑے اتھرے مرد امن پسند ہوجاتے ہیں۔ پہلے پہل تو یہ مرض چالیس سال کی عمر کے بعد ہی ہوا کرتا تھا اور تب تک انسان بہت کچھ دیکھ چکا ہوتا تھا مگر اب تو جوانوں اور بچوں کو بھی ہوجاتا ہے اسی لئے شوگر کو دو قسموں ٹائپ ون اور ٹائپ ٹو میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ایک چالیس سال سے پہلے ہونے والی اور دوسری چالیس سال کے بعد ہونے والی۔ اسی طرح بعض عورتوں کو دوران حمل بھی شوگر ہوجاتی ہے جو کہ عموماً بچے کی پیدائش کے بعد ختم ہوجاتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ ماں اور بچے کو مستقلاً ہی ہوجاتی ہے یعنی اس کی تباہ کاریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ہمارے ملک میں ہر چوتھا فرد اس کا شکار ہے۔

ایک اور مرید نے پوچھا کہ پتا کیسے چلتا ہے کہ شوگر ہوگئی ہے، تو حضرت نے فرمایا کہ جب تک پیاس نہ بجھے، دل گھبرائے اور ہر

پندرہ بیس منٹ بعد یا آدھے گھنٹے بعد زوروں کا پیشاب آئے جو کنٹرول سے باہر ہو اور نزدیک نزدیک کوئی جائے پناہ میسر نہ ہو اور قدرت اپنا کام کر جائے اور انسان نماز پڑھنے کے قابل نہ رہے تو اور یہ وقفہ اِتنا ریگولر ہو کہ لوگ وقت کا اندازہ آپ کے ٹائلٹ کے چکروں سے کرنے لگیں تو سمجھ جائیں کہ آپ کو یہ ذلیل و منحوس مرض ہو چکا ہے۔ پھر ٹیسٹ کروا کے کوئی دافع ذیابیطس گولی طبیب کے مشورے سے لیں یا انسولین شروع کر دیں تا کہ ٹوائلٹ پہ پریڈ کچھ کم ہو۔ مرض تو کم نہیں ہوگا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے گا حتیٰ کہ آپ کو قبر میں لے جائے گا لیکن آپ کی موت شوگر سے نہیں بلکہ اس سے ہونے والی بیماریوں سے ہوگی، حتیٰ کہ شوگر شروع میں اَپ ہوتی ہے اور اسے کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے جبکہ کچھ عرصے بعد جب بندہ کمزور ہو جاتا ہے تو لو ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت ایسی ہی کوئی چیز کھانا پڑتی ہے جو سختی سے منع ہو یعنی چینی گلوکوز، گلقند وغیرہ لیکن تھوڑی مقدار میں۔ یہ نہیں کہ کلی اجازت ہوگئی، اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی صورت میں پھر شوگر آؤٹ آف کنٹرول ہو سکتی ہے اور اسی حالت میں کچھ نہ کچھ کھانے کی صورت میں ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔ اس سے ہی اس مرض کی مکاری کا اندازہ لگا لیں کہ بندہ مرتا بظاہر کسی اور وجہ سے ہے لیکن اس کے پیچھے اصلی ہاتھ شوگر کا ہوتا ہے۔ جیسے مسلمانوں کے خلاف ہر سازش کے پیچھے امریکہ یا اسرائیل کا ہاتھ ہوتا ہے۔

تیسرے مرید نے اس کے اہم اثرات کے بارے میں پوچھا تو حضرت بولے کہ یہ مرض عموماً نرم مزاج لوگوں کو ہوتا ہے جو کھاتے تو اچھا خاصا ہیں لیکن اس کھائے پیے کو حلال کرنے یا کسی بھی محنت یا ورزش کرنے کی کوئی ایماندارانہ کوشش نہیں کرتے۔ لیکن اگر وہ نازک مزاج نہ بھی ہوں تو اس مرض کے بعد ضرور نازک مزاج ہو جاتے ہیں۔ ذرا سا زخم ٹھوکر لگنے سے بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور شوگر کنٹرول نہ ہو تو متاثرہ حصہ کاٹنے کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ اس انجام سے بچنے کے لئے شوگر کنٹرول کر کے زخم کا علاج بڑی پابندی سے ضروری ہے،

ویسے شوگر کے مریض سے دشمنی نکالنا بڑا ہی آسان ہے جیسے بلڈ پریشر کے مریض کو زیادہ نمک والی چائے پلا کر اس کی شریان تک پھاڑ سکتے ہیں، جس کے بعد وہ بچ بھی گیا تو ساری عمر فالج کا شکار رہے گا۔ ویسے ہی اگر شوگر کے مریض کو اصرار کر کے زیادہ چینی والی چائے لگاتار پلاتے رہیں تو وہ چند دنوں میں ہی آدھا ہو جائے گا اور اگر آپ مذاق مذاق میں اسے کوئی کٹ یا ٹھوکر لگا دیں تو وہ معذور بھی ہو سکتا ہے کیونکہ شوگر والوں کے معمولی زخم جلد ہی غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ بس ذرا سی بے احتیاطی اور ایک دو بار زخم کی تجدید ہی کافی ہے اور یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ ٹھوکر عموماً وہیں لگتی ہے جہاں زخم ہوتا ہے۔

اس گل افشانی گفتار میں حضرت کا سانس پھول گیا آنکھیں سرخ ہو گئیں بلڈ پریشر بڑھ گیا اور شوگر کچھ کم ہو گئی جس سے ان کا

جسم ہولے ہولے لرزنے لگا۔گلوکوز کی ایک چٹکی پھانکنے کے بعد کچھ نارمل ہوئے تو ایک مرید نے جرات کرتے ہوئے کہا کہ کتنی بیماریاں ہیں جو شوگر سے بھی بڑھ کے موذی ہیں اور خطرناک ہیں، شوگر کے برعکس وہ ناقابل برداشت ہیں جیسے کینسر۔ خشمگیں نگاہوں سے اس ناہنجار کو گھورا کیونکہ اختلاف رائے حضرت کو بالکل پسند نہ تھا اور اس سے ان کا بلڈ پریشر مزید بڑھ جاتا تھا کہ اب تو ان میں بلڈ کم ہی رہ گیا تھا، بس پریشر ہی پریشر تھا اور اسی پر ان کا گزارا تھا۔ بیوی تو برداشت کرتی نہ تھی اس لئے مریدوں کا دم غنیمت تھا۔ سوچتا ہوں مرید نہ ہوتے تو حضرت صاحب دماغ کی شریان پھٹنے سے کب کے فوت ہو چکے ہوتے، گو ان کے اکثر مرید توصماً بکماً عمیاً ہی تھے جنہوں نے کبھی اپنا دماغ استعمال کرنے کی زحمت ہی نہ کی تھی۔ حضرت صاحب سچ جھوٹ جو بھی فرما دیتے تھے، آمین کر دیتے تھے مگر چند ایک جدید تعلیم کی بدولت خراب ہو گئے تھے اور کبھی کبھار اعتراض کر دیا کرتے تھے۔

مذکورہ مرید بھی ان میں سے ایک تھا۔ بات اس کی ٹھیک تھی لیکن اگر حضرت اسے تسلیم کر لیتے تو دوسرے اندھے مریدوں پر برا اثر پڑتا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت نے فرمایا ''دیکھو! کینسر کا تو پھر بھی قدرِ علاج موجود ہے ایک بار کورس لگے تو کچھ ماہ بعد ہی دوبارہ کورس کی ضرورت پڑتی ہے یہ تو نہیں کہ صبح شام سوئیاں چبھوائی جائیں اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے نازک جگہوں پہ، باقی جہاں تک تکلیف کا تعلق ہے تو وہ تو ہونی ہی ہے۔ آخر بیماری جو ہوئی لیکن اگر بندہ بیماری کا عادی ہو جائے تو یہ معمول کی بات ہو جاتی ہے اور بندہ اس سے لطف اندوز ہو بھی سکتا ہے۔ وہ بدپرہیزی کر کے بیماری سے پنگا لیتا ہے، نتیجے میں وہ بندے کو لمبا کر دیتی ہے پھر بندہ دوائی کا سہارا لے کر دوبارہ حالات کو نارمل کرتا ہے یہ آنکھ مچولی مرتے دم تک چلتی رہتی ہے۔

حضرت نے بات ختم کی تو مریدین سر دھن رہے تھے جبکہ میرا جی تو ان کی دھنائی کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مذکورہ مرید بھی الٹے سیدھے دلائل سے مطمئن نہ بھی ہوئے تھے تو ان کے جلال سے چپ تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے پوچھا کہ حضرت آپ کا تجربہ شوگر تک ہی محدود ہے یا کسی اور بیماری کے بارے میں بھی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں تو بولے ''اس عمر عزیز میں شاید ہی کوئی بیماری ہو جس سے پنجہ نہ ہوا ہو اس لئے ہر بیماری کا حال بیان کر سکتا ہوں لیکن شوگر کے علاوہ اگر کوئی بیماری میرے لئے سب سے زیادہ تشویش ناک ہے تو وہ نزلہ زکام ہے جو کہ دراصل ایک بیماری نہیں بلکہ اس بیماری کا آغاز عموماً سرد یا گرد آلود ہوا کے باعث ہوتا ہے جس میں بار بار خالص پانی ناک سے خارج ہوتا ہے اور بندہ کم از کم تین دن کے لئے کسی محفل میں بیٹھنے، کوئی کام کرنے حتیٰ کہ سونے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ اس دوران دوا لو یا نہ لو تین دن بعد نزلہ گاڑھا ہو جاتا ہے اور بالآخر زکام میں بدل جاتا ہے جس سے سانس کی تنگی پیدا ہوتی ہے اور دمے کی سی کیفیت ہو جاتی ہے جو کہ مزید تین دن کے بعد ترقی کر کے کھانسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یوں کھانسی اور بلغم کے باعث بندہ ایک بار پھر کسی کے پاس بیٹھنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب جوشاندے، سٹرپ سلز اور کھانسی کے شربتوں اور اینٹی بائیوٹک ادویات کا نیا دور چلتا ہے جو کم از کم ایک ہفتے تک جاری رہتا ہے، اس کے ساتھ سر درد، بخار اور پھیپھڑوں میں بھی درد بونس میں ہوتا ہے اور اگر اس کی صحیح خاطر داری نہ کی جائے یعنی سیریس نہ لیا جائے تو یہ ٹی بی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کا علاج تین ماہ سے ایک سال تک جاری رہ سکتا ہے اور اس سے پھیپھڑے اور معدہ متاثر ہو سکتے ہیں۔''

اس کے بعد حضرت نے محفل برخاست کر کے مریدین کی جاں بخشی کر کے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آ رہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اولین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

نادر خان سرِ گروہ

جب میں حاملہ ہوا

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مَیں جوانی کی چوٹی پر یہ طے کر رہا تھا کہ کس سمت زندگی کے جھمیلوں کی کھائی میں چھلانگ لگائی جائے۔ ایک نجومی نے مجھ سے کہا ''آگے چل کر تم تین بچوں کے باپ اور چار بچوں کی ماں بنو گے۔''

اِس سے پہلے کہ مَیں اُس سے اِس متضاد پیشین گوئی کی گرہ کھلواتا، وہ مجھے الجھن میں ڈال، سر کھجاتا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ سوال مجھے ہمیشہ پریشان کرنے لگا کہ مَیں ماں بنوں گا؟ وہ بھی تین کے مقابلے میں چار بچوں کی ماں۔۔۔یعنی باپ کم ماں زیادہ!

اپنے دوست پُر جوش پوری سے ایک روز ڈرتے ڈرتے پوچھا ''پر جوش! jeans کی

ہمارے دوست افتخار احمد بٹ کاروبار کے سلسلے میں چند برس نائیجیریا کے شہر لاگوس میں رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہاں ڈاکے اتنی کثرت سے پڑتے تھے کہ لوگوں نے ان کا نوٹس لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکہ پڑتا اور ڈاکوں کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد موقع واردات پر دوبارہ معمول کی کاروائی شروع ہو جاتی۔ ایسے مواقع پر پولیس کو بھی بہت کم تکلیف دی جاتی تھی کیونکہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح وہاں کی پولیس بھی نعرہ عوام کی مدد کا لگاتی ہے اور ساجھے داری چوروں سے کرتی ہے۔

پنجاب کے کسی دیہات میں مال مسروقہ کی رپورٹ لکھی جا رہی تھی' پولیس کے محرر نے جب فہرست مکمل کی تو اس میں ایک بھینس کی چوری کا اندراج بھی تھا' اچانک محرر کی نظر صحن کے کونے میں جگالی کرتی ہوئی بھینس پر پڑی' اس نے غصے سے مدعی کی طرف دیکھا اور کہا "اوئے بھینس تو وہ سامنے موجود ہے اور تم نے رپورٹ میں لکھایا ہے کہ یہ چوری ہو گئی ہے!"

ستم ظریف مدعی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور باقی سامان چور لے گئے ہیں یہ آپ کی تفتیش کی نذر ہو جائے گی تو میری طرف سے تو گئی نا۔"

پرانی آنکھیں نئے خواب از امجد اسلام امجد

تبدیلی۔۔۔دشوار کُن مرحلہ ہوتا ہے کیا؟"

اُس نے بے رغبتی سے جواب دیا" اِس میں کیا دشواری؟ ۔۔۔مَیں تو آئے دن تبدیل کرتا رہتا ہوں۔"

مَیں نے کہا "jeans کی تبدیلی کی نہیں! تبدیلی جنس کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔مَیں سمجھا، تم اُس "جینس" کی بات کر رہے ہو جسے "جینسین" ہفتوں نہیں بدلتے۔۔۔ سچ کہوں! مَیں اِس مرحلے سے گزرا تو نہیں مگر یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انتہائی تکلیف دہ مرحلہ ہے۔"

مَیں نے اُسے نجومی کی پیشین گوئی اور اپنی کشمکش کی بابت بتایا۔ وہ غلط انداز نظروں سے مجھے یوں گھورتا رہا، جیسے اپنے تصور میں میرا Makeover کرنے کے بعد تبدیلی کو مجسم دیکھ رہا ہو۔

مَیں نے اُس کی توجہ کا کان زور سے پکڑا اور مستقبل سے کھینچ کر حال میں لاتے ہوئے کہا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

اُس نے دانشورانہ لہجے میں اپنی رائے دی "پیشین گوئی کی ترتیب تو یہی بتا رہی کہ سرِ دست تمہیں "صنفِ نازک" سے بندھ جانا چاہیے. اب کے بارات لے جاؤ! اُس کے بعد دیکھو کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یا وقت کی ہرنی کیسے انگڑائی لیتی ہے۔"

"اگر" خلافِ توقع کچھ گڑبڑ ہوئی تو۔۔۔؟"

"مَیں ہوں نا!"

مَیں نے غصے اور صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے اُسے یوں دیکھا، جیسے کوئی لڑکی اپنے گھر گھوڑے کی بجائے خچر پر سوار ہو کر آئے لڑکے کے رشتے کو نامنظور کرتی ہے۔

پُل کے نیچے سے بے شمار پَل گزر چکے۔ وہ گھڑی بھی آ گئی کہ نجومی کی پیشین گوئی لفظ بہ لفظ دُرست ثابت ہونے لگی۔ تین بچوں کا باپ بننے کے بعد مَیں ایک بچے کی ماں بن گیا۔۔۔ اپنی پہلی معنوی اولاد کا نام مَیں نے "باادب بامحاورہ ہوشیار" رکھا۔

اِن دنوں میری دوسری کتاب میرے دماغ کی کوکھ میں ہے۔

نادر خان سرِ گروہ کا تعلق نیو ممبئی، بھارت سے ہے تاہم برسہا برس سے بسلسلۂ روزگار سعودی عرب میں مقیم ہیں۔ لکھنے لکھانے کا سلسلہ کافی عرصہ سے شروع کر رکھا ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین لکھنے میں یدِ طولیٰ رکھتے ہیں۔ اندازِ تحریر میں مزاح کی شگفتگی اور طنز کا ڈنک بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی مضامین کی ایک کتاب "باادب بامحاورہ" شائع ہو کر پڑھنے والوں سے دادِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کے اوّلین لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ری چارج والی صبا

کرسس پر کیا میسج یہ مس نے
بہت کرتی ہوں مس جانم خبر لو
تمہیں مس کال کرنا بھی ہے مشکل
موبائیل کو مرے ری چارج کردو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دانائی

کہا اماں نے بیٹے سے نہ چلا کر دعا مانگو
خدا دل کی دعا سن سکتا ہے بہرہ نہیں ہے وہ
تو بیٹا بولا بائیک کی دعا میں مانگتا ہوں یوں
سنائی کافی کم دیتا ہے میرے دادا ابا کو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اصل بات

تحفہ اچھا ہے کرسس کا یہ ڈائمنڈ نیکلیس
دوست بولا پر تمہاری بیوی تو مانگے تھی کار
ہنس کے شوہر نے کہا کہتے ہو تم بالکل بجا
لاؤں میں لیکن کہاں سے یہ بتاؤ نقلی کار

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دہشت گرد گوبھی

شریفوں کی زباں سے آدمی عزت ہی پاتا ہے
رذیلوں کی زباں ایسی جسے سن کر ہی دم نکلے
مجھے بند گوبھی لینے میں عجب وحشت سی ہوتی ہے
یہ وردی والا اس کو کیا پتا کس وقت بم کہہ دے

چونچ گیاوی

چور سپاہی

کارآمد جس کو کہتے تھے وہ اب ناکام ہے
چیز جو انمول تھی اُس پہ بھی لکھا دام ہے
کیجئے گا اب بھروسہ کس پہ، یہ بتلایئے!
سی بی آئی پر بھی رشوت لینے کا الزام ہے

چونچ گیاوی

لیڈرانِ قوم

خواب میں رام نے کہا مجھ سے
بینگ کی طرح ٹرّاتے ہیں
چند لیڈر ہیں، ہم جنہیں اے چونچ
بس الیکشن پہ یاد آتے ہیں

چونچ گیاوی

چھیڑ خانی

عدالت سے کہا یہ ای وی ایم نے
ہم اپنے ملک میں ہیں پانی پانی
ہمارے ساتھ بھی انصاف کرنا
یہ نیتا کر رہے ہیں چھیڑ خانی

چونچ گیاوی

سانحہ

اپنے بیٹے سے باپ نے یہ کہا
میری باتوں کو ٹال مت دینا
سب تمہارے ہی نام کردوں مگر
مجھ کو گھر سے نکال مت دینا

چونچ گیاوی

خودکار دھندہ

کسی کو تیل پڑھ کر دے دیا ہے
کسی کے گھر پلیتہ جل رہا ہے
کرشمہ مولوی صاحب کا دیکھیں
بنا پونجی کے دھندہ چل رہا ہے

چونچ گیاوی

خطرہ

اپنی بیٹی سے باپ نے یہ کہا
مجھ کو الجھن میں ڈال مت دینا
لکھنے پڑھنے تو جا رہی ہو مگر
میری پگڑی اچھال مت دینا

چونچ گیاوی

جذبۂ عشق

کوئی رنج و الم نہیں ہوتا
جیل جانے کا غم نہیں ہوتا
گھومتا ہے گدھے پہ وہ پھر بھی
جذبۂ عشق کم نہیں ہوتا

چونچ گیاوی

ناامیدی

پرائے دیس سے ہرگز وہ کالا دھن نہ لائیں گے
ہمیں اور آپ کو یونہی سدا الو بنائیں گے
کہا بچے نے سنئے چونچ انکل کہہ رہا ہوں میں
ابھی دو تین برسوں تک وہ اچھے دن نہ آئیں گے

چونچ گیاوی

حصے کے احمق

قوم کو لوٹ کر کھا گئے ہر طرح
پر مذاقِ ندامت ہی مفقود ہیں
شیر کیوں نہ دِکھیں، ڈھیٹ کیوں نہ بنیں
اُن کے حصے کے احمق جو موجود ہیں

نوید ظفر کیانی

جمہوریت

جمہوریت کے نام پہ ہوتا ہے جو ظفرؔ
بازیگری کچھ اور ہے، جمہوریت نہیں
جمہوریت کے دور میں دیکھا گیا سدا
جمہوریت کا شور ہے جمہوریت نہیں

نوید ظفر کیانی

دعا

سخی بزرگ دعا مانگتے تو ہیں، گرچہ
کسی کو علم نہیں کس کو کتنی عمر ملے
دعا درازیٔ عمرِ شریف یوں بھی ملی
خدا کرے تجھے شیطان جتنی عمر ملے

نوید ظفر کیانی

نوبت ایں جا رسید

چھین لیتے ہیں منہ سے نوالے بجٹ
ہم غریبوں کا جینا ہے کس ذعم کا
ہر بجٹ کی ہے غایت یہی غالباً
گھاس کھانا تمدن ہو اِس قوم کا

نوید ظفر کیانی

دیکھنا !

قیمتیں پوچھی نہیں جاتیں ظفرؔ
عارضۂ دِل کا رہتا ہے ہراس
یونہی مہنگائی رہی تو ایک دِن
جانگیہ بن جائے گا قومی لباس

نوید ظفر کیانی

نو بال

زیست کے بال کو سمجھا دو ظفرؔ
کیریئر اُس کا رہینِ حال ہے
کہتی ہے تقدیر کی ایمپائرنگ
دِل کی پچ پر عقد اِک نو بال ہے

نوید ظفر کیانی

مولا بخش

جو رٹا بازیاں ہی علم ٹھہریں
کوئی کیا خاک ہو گا دید ''جوگا''
وہاں بچے نہیں طوطے پڑھیں گے
جہاں اُستاد مولا بخش ہو گا

نوید ظفر کیانی

بیان باز بان

بیانوں کے دو ہتھڑ مارتے ہیں
بیانوں کے دو ہتھڑ جھیلتے ہیں
سیاستدان کہ مجبور ٹھہرے
یوں اپنی اپنی ریڑھی پیلتے ہیں

نوید ظفر کیانی

رشوت

کسی سرکاری ایوان میں
کوئی فائل بھی پھنسنے نہ دی
جس کو کہتے ہیں رشوت ظفرؔ
''ماسٹر کی'' ہے ہر قفل کی

نوید ظفر کیانی

تفتیش

پلس تھانے بلا کے عاشقوں سے
بس یہی اک سوال پوچھتی تھی
یہ بتاؤ کہ رات بارہ بجے
کوئے جاناں میں کس کی ڈیوٹی تھی

ڈاکٹر عزیز فیصل

تبدیلی آئی رے ---

شیروانی کا بٹن

جو نہ دینا چاہتے تھے شیروانی کا بٹن
وہ پریشاں ہیں بہت شرمندہ اور حیران ہیں
خالقِ ''عمران سیریز''، آؤ اے ابنِ صفی!
سندھ میں عمران ۲ ہیں، مرکز میں بھی عمران ہیں

اپوزیشن کے ایک لیڈر پرویز رشید نے کہا تھا کہ ہم عمران خان کو وزیراعظم کی شیروانی کا ٹوٹا ہوا بٹن بھی نہیں دیں گے۔

نواز اور عمران کا فرق

نام کے آغاز میں ہے ''نون'' وہ ناکام ہے
''نون'' آخر میں ہے جس کے وہ ہوا ہے کامران
شخص پہلا ہے نواز اور دوسرا عمران ہے
قوم کی قسمت بدلنے آگئے عمران خان

عمران سیریز اور تکبر

غور اِس پر ہو، تکبر میں ہوا ابلیس خوار
کیا نظر آتی نہیں ہے قدرتِ حق کی ضیاء
راس آتا ہی نہیں بندے کو لہجہ پُرغرور
وَ تُعِزُّ مَن تَشَاء وَ تُذِلُّ مَن تَشَاء

۲۔ عمران اسمٰعیل (نامزد گورنر سندھ) ۔ ۳۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۲۶

نام سے نفرت

پھول! کیا عمران کی سیریز ہے، دیکھو ذرا
والدِ موسیٰؑ کا نام اور والدِ مریمؑ کا نام
والدِ حیدرؓ، ابوطالب کا بھی یہ نام تھا
''آلِ عمراں'' نام کی سورت ہے جو رب کا کلام

کچھ عرصہ پیشتر ایک معروف شخصیت نے ٹی وی پر کہا تھا کہ انھیں ''عمران'' نام سے بہت نفرت ہے، درج ذیل قطعہ اسی کا جواب ہے۔ اب وہ شخصیت ''مشرف بہ تحریک انصاف'' ہو چکی ہے، ہے نا حیرت کی بات!

شیر اور بلّا

ہم نے ٹی وی پر لکھا دیکھا، زبر اس پر نہ زیر
شیر اور بلّے کا یارو ! پھر ہُوا ہے معرکہ
ہم لگا کر زیر، پڑھ سکتے ہیں اس کو یوں بھی پھولؔ!
پیڑ پر بلّا چڑھا اور شیر تکتا رہ گیا

وہ میرا گھوڑی چڑھیا

دو صوبے دو دولہا

باز کے پردے میں کرگس گلبنِ پنجاب میں
فیصلہ عمران کا ہے، اب وہاں عثمان ہوں
سندھ میں عمران اسمٰعیل کو کرنا ہے کام
چور سب ہوں نامراد اور شاد عام انسان ہوں

عمران خان (وزیر اعظم)، عمران اسمٰعیل (گورنر سندھ)

عثمان بزدار

سرنگوں ہے شیر اور پنجاب میں بز دار ہیں
جو ضعیف و ناتواں ہیں اُن کا بھی اونچا ہو سر
ہر جگہ ہو بول بالا عدل اور انصاف کا
شیر اور بکری سدا پانی پئیں اِک گھاٹ پر

فارسی میں "بز" بکری کو کہتے ہیں۔ پنجاب میں وزیر اعلیٰ کے انتخاب میں ن لیگ کے امیدوار کو شکست ہوئی اور تحریک انصاف کے عثمان بزدار جیت گئے تھے۔

عمران اسمٰعیل کا حلف

پھولؔ ! سنو تم، کیا کہتے ہیں فیصل اور عمران ا؎
جو ہیں نکلے، کام کریں، آرام کریں تھوڑا
فوجِ محمد بن قاسم ہے تحریکِ انصاف
چور اور ڈاکو مل کر بولے "گھوڑا رے گھوڑا" ۲؎

ا؎ فیصل واوڈا اور عمران اسمٰعیل ۲؎ اندرون سندھ میں "باپ رے باپ" کی جگہ "گھوڑا رے گھوڑا" بولتے ہیں۔

سپیکر اور ڈپٹی سپیکر

اپنے اسپیکر اسد ا؎ ہیں، بے گماں وہ شیر ہیں
ڈپٹی اسپیکر ہیں سُوری، وہ بنیں گے شیر شاہ ۲؎
تم نے جو وعدے کئے تھے، وہ نبھانے ہیں سبھی
قوم جو بھرتی تھی آہیں، اب کرے وہ واہ! واہ!

ا؎ اسد عربی میں شیر کو کہتے ہیں۔ ۲؎ شیر شاہ سوری

اور صدر

دو بلّیوں کا فیصلہ بندر نے جو کیا
معلوم ہے سبھی کو، اسے مت سناؤ پھولؔ !
کیا صدر وہ بنے گا جو آزادی کے خلاف؟
کیسا نکاح خواں ہے جو کہتا ہے خود "قبول"

نے گور بان نون پران کرو

بنی گالہ اور اڈیالہ

یہ بنی گالہ ہے ، اڈیالہ ہے وہ
ہیں یہاں عمران اور واں ہیں میاں
جو ہڑپ کر کے ہیں بیٹھے مال مفت
پیٹ میں ان کے بہت ہے چیپیاں

جواب دو

"ہر کمالے راز والے، تم اسے بھولے تھے کیوں؟
نون مسلم لیگ، پی پی سب ہیں کرتے آہ! آہ!!
ایک ہنگامہ بپا ہے، چوروں میں ہے کھلبلی
تین عشروں میں کیا تم نے ہے کیا خورشید شاہ؟

اے میاں کمسن بلاول!

اے میاں کمسن بلاول ! تجربہ حاصل کرو
پڑگیا ''بلاّ'' جو سر پر ''وِل'' تمھاری رہ گئی
آنے والی ہے'' بلاّ'' کر دے گی جو زیر و زبر
''وِل'' بشکلِ ''وَل''، مرادِ دل تمھاری رہ گئی

بلاول بھٹو زرداری کی شدت سے خواہش وزیر اعظم بننے کی تھی جسے انگریزی میں ''وِل'' کہا گیا ہے۔ گزشتہ دن کے قطعے میں آخری جملہ پورا چھپنے سے رہ گیا ہے جو یہ ہے۔ جو لوگ غلط العام ہی پڑھنا چاہتے ہیں، وہ اس طرح پڑھ لیں۔
بند ہیں دروازے تم پر، کیا خلَف کا ہے سوال؟

بوکاٹا

میانوالی اور میاں

میانوالی، میانوالی، میانوالی، میانوالی
کوئی ہے بیوی والا بھی؟ کوئی اس کا بھی ہے سالا؟
شرافت کے لبادے میں چھپا تھا کیا؟ ہُوا عریاں
میانوالی کے باسی نے ''میاں'' کو قید کر ڈالا!

شہباز شریف کی گرفتاری

فوج سے ڈاکوؤں کی، ڈراتا ہے وہ
ریچھ کا ہے جو ہمراز، پنجرے میں ہے
چڑیا گھر اِک بڑا سا، یہاں کھول لو
شیر پنجرے میں تھا، باز پنجرے میں ہے

بیمار شیر

جنگل کے ہی قانون سے وہ بادشاہ تھا
پنجرے میں غم زدہ ہے بہت، سو گیا ہے شیر
جنگل کی بادشاہی چھنی، مضمحل ہُوا
''بلّے'' سے مار کھائی تو ''بلّی'' بنا ہے شیر
(صنعت تجنیس خطی)

پمز ہاسپٹل

چُبھ رہا ہے دل میں کانٹا، بادشاہی چھن گئی
تار جو ''اسٹنٹ'' کا تھا، بن گیا وہ خار ہے
گوشت کے بدلے اُسے ملتی ہیں اُبلی سبزیاں
شیر سبزی کھا رہا ہے ''پمز'' میں بیزار ہے

بعد از مرگ واویلا

دھاندلی

چیخ نکلی، نہ جب اُن کو کرسی ملی
کیا غضب ہوگیا ! بادشاہت چھِنی
نکلی ہذیانی حالت میں پیہم صدا
دھاندلی، دھاندلی، دھاندلی، دھاندلی

اب کیا ہوت!

عدل کے دشمن اکٹھے ہو کے یہ کہتے ہیں پھول!
چین سے کرنے نہ دیں گے ملک میں عمراں کو راج
موٹے بھالو کی طرح فضلو اُچھلتے آ گئے
شیر ہے پنجرے میں، شیری کر رہی ہے احتجاج

سیاست کے نکو

بند ہیں دروازے تم پر، خلف اے کا ہے کیا سوال؟
ہار کر اب جنگلوں میں ہی لگاؤ جمپ تم
''دھاندلی'' کا غُل مچانے سے نہیں کچھ فائدہ
مولوی ڈیزل ! چھپائے پیٹ میں ہو پمپ تم!

اے لفظ ''خلف'' میں عربی میں حرف ''ل'' ساکن ہے جبکہ اُردو میں ''ل'' پر زبر غلط العام ہے۔ (بحوالہ فیروز اللغات) جو لوگ غلط العام پڑھنا چاہتے ہیں وہ اس طرح پڑھیں۔۔۔ کیا خلَف کا ہے سوال؟

جشنِ آزادی کا قضیہ

جشنِ آزادی اور فضلو

پھولؔ! دیکھو بے اثر ہے مولوی ڈیزل کا وعظ
جشنِ آزادی منایا قوم نے، آئی بہار
آنکھیں اپنی بند کر کے وہ بہت غصے میں ہیں
اب پٹاخہ بم وہ چھوڑے جا رہے ہیں بار بار

علاج

جن کو پاکستان سے الفت نہیں، ہیں خود غَرَض
پھولؔ! وہ رہتے ہیں کیوں اِس ملکِ پاکستان میں
یومِ آزادی منانا اُن کو بے حد ناگوار
بند کر دو مولوی ڈیزل کو اب زندان میں

اور یہ لیڈرانِ گرامی

مَرَغ اور مُرغ

بھیس میں رہبر کے، پیہم رہزنی کرتے رہے
کھا گئے ملکی خزانہ لُوٹ کر، ڈاکو بنے
اپنے لیڈر خر ہیں پر عیّار مانندِ شغال
مَرَغ کو وہ مُرغ بولے اور اذاں دینے لگے

توندوں کی تجاوزات

ہمارے ملک میں لیڈر حرام خور ہوئے
سخنوران تو گردانِ فاعلات میں ہیں!
علاج اِن کا بھی یارو ! بہت ضروری ہے
بڑھے جو پیٹ ہیں، وہ بھی تجاوزات میں ہیں

حرامخور لیڈر

''د'' سے جو دال ہے، وہ بھی بہت مہنگی ہوئی
پیٹ خالی ہے غریبوں کا، بھلا وہ کیا کریں!
''ڈ'' سے جو ڈال ہے، چیلوں کا اس پر غول ہے
گوشت کا ہے منتظر، کچھ بھوکے اب جلدی مریں

لوٹا ای اوئے

قلابازیاں

یہاں مرد لیلیٰ ہے، مجنوں ہے عورت!
ہے باطن میں کیا؟ تجھ پہ ظاہر نہیں ہے
قلابازیاں، یاں کا معمول اکثر
سیاست میں کچھ حرفِ آخر نہیں ہے

تمنّائے اقتدار

کئے ہزار جتن پر گورنری نہ ملی
وزیر کم سے کم اس کو بنا دیا ہوتا!
بنا ہے لوٹا ، کبھی یہ اِدھر، کبھی ہے اُدھر
ملی تھی پہلے وزارت، وہ دَور یاد آیا

بارے "ڈیزل" کے

عمران اور فضلو

کوئی تالابِ سیاست سے اُٹھا جو مثلِ غوک ا؎
ٹرٹرانے جب لگا، عمران آگے تن گیا
ہمتِ مرداں مدد حاصل کرے اللہ کی ۲؎
ہمتِ عمراں کے آگے شیر، بکری بن گیا!

ا؎ مینڈک ۔ ۲؎ ہمتِ مرداں مدد خدا

ہوسِ اقتدار

اگر بھارت سے دعوت آئے، آؤ ! صدر بن جاؤ
تو فضلو دوڑے جائیں گے، ہمیں اس میں نہیں ہے شک
لٹیرے قومی دولت کے، سزا پائیں، یہ ہو کوشش
جنھیں اپنی غرض پیاری، انھیں دینی ہے مل کر زک

پادیولسیاں!

پیسے جو لوٹ لوٹ کے، باہر ہیں لے گئے
گردن سے ان کو پکڑو کہ لائیں وہ سارا مال
مانیں نہیں تو خوب ہی جوتے لگاؤ تم
مرغا بناؤ، کاٹ دو پر ، کھینچو ان کی کھال

یادِ ماضی عذاب ہے یارب!

یاد اُن کو آ رہا ہے اپنی کرسی کا مزہ
کہہ رہے ہیں وہ لٹیروں سے، میاں! کچھ تو کرو
ڈر ہے ان کو، تو ند اُن کی اب پچک جائے نہ پھول!
مولوی ڈیزل کی ٹنکی میں نیا ڈیزل بھرو

اِن شاءاللہ

ڈاکو تو ہوں گے قید، مشقت بھی کرنی ہے
چربی بدن پہ اُن کے ہے، اُس کو گھلائے گی
مالِ حرام کھایا ہے ، لوٹا ہے قوم کو
آئی ہے "پی ٹی آئی"، وہ "پی ٹی" کرائے گی

سبق پھر پڑھ عدالت کا

عدلیہ

اب ڈاکوؤں کی فوج کو گھیرے ہے عدلیہ
وہ بھاگنے نہ پائیں ، کریں احتیاط سب
پبلک تو مر رہی تھی ، وہ مشغول عیش میں
ہر دَم سجائے بیٹھے تھے بزمِ نشاط سب

ذاتی اکاؤنٹ

بولے بادامی اے سے یہ اٰنحق ڈار
ڈیڑھ ارب ڈالر تھے "تحفے" میں ملے
ہیں سعودی، دوست اپنے بے بدل
ہم نے وہ "ذاتی" اکاؤنٹ میں لئے

اے وسیم بادامی

کچھ شراب آئے

کڑا احتساب

چور ڈاکو کر رہے ہیں سازشیں ، ہشیار قوم!
عدلیہ کو چاہئے ، سب کا کڑا ہو احتساب
پکڑے جائیں چور سارے ڈاکوؤں کو ہو سزا
یوں لگے جیسے وطن میں آ گیا یومِ حساب

تین شین

شرجیل ہوں، شراب ہو یا شہد ہو وہاں
تینوں ہیں حرفِ شین سے، یہ سب پہ ہے عیاں
پہلے جو دو ہیں، "شر" سے ہوئی ان کی ابتدا
خالص اگر ہو شہد تو کیا بات ہے میاں!

معیشتِ بیمار

ڈالر کی پرواز

خوشحالی کا تھا سپنا، وہ اب بھی خواب ہی ہے!
پبلک تو پس رہی ہے، روزی نہیں میسر
چین و عرب ہیں ساتھی، دونوں نے کی مدد ہے
حیران ہم ہیں اس پر، ڈالر کو کیوں لگے پر؟

اُف یہ قرضہ

آئس کریم مفت کی سمجھو نہ اس کو تم
لینے سے پہلے، سوچ لو اے یار! بار بار
تحت الثریٰ میں جائے گا رُپیہ، یہ جان لو
مہنگائی ساتھ لائے گا ڈالر کا یہ اُدھار

چکر پہ چکر

لُوٹ کے ہر ڈاکو نے کھایا
لی نہ ڈکار اِک، بھاگا فرفر
پبلک پاکستاں کی پریشاں
ڈالر، ڈیم اور ڈار[1] کا چکر

[1] اسحٰق ڈار

اُف یہ مہنگائی

"ڈ" کی دھمال

اپنے وطن کو یارو! ہیں "ڈ" سے مسائل
ڈالر ہو، ڈیم ہو یا پھر ڈاکوؤں کا ٹولا
رہبر بنے رہے وہ، کرسی سے تھے وہ چمٹے
پبلک پہ پھٹ پڑا ہے مہنگائی بم کا گولا!

ٹیکس

اپنے وطن میں دوستو! ہر چیز پر ہے ٹیکس
کھانے کی کوئی چیز ہو یا ہو کوئی دوا
اب شور کیوں مچا ہے کہ دیتے نہیں ہو ٹیکس؟
لیتے ہو دودھ پر بھی جو بچّوں کی ہے غذا

دیگر شغلیات

دوسری شادی

ہمارے دوست ہیں اِک مولوی صاحب جو کہتے ہیں
رکھیں گے بیویاں چار اپنے گھر میں، ہے یہ آزادی
اجازت یہ خدا نے دی ہے اس میں شک نہیں کوئی
مگر آدمؑ نہ کر سکتے تھے ہر گز دوسری شادی!

اسٹیفن یا اسٹیپ ہن

سامنے گھر پر لگا تھا بیگم اسٹیفن کا بورڈ
دیکھا جب ننھے میاں نے، ہم سے وہ کہنے لگے
کیا یہاں "سوتیلی مرغی" رہتی ہے؟ بتلایئے
کب سے مرغے مرغیاں اس شان سے رہنے لگے!

"اسٹیفن" کے سپیلنگ 'ایس ٹی ای پی ایچ ای این' ہے۔ اگر اسے دو ٹکڑوں میں پڑھا جائے تو "اسٹیپ ہن" یعنی "سوتیلی مرغی" بن جاتی ہے۔

سوتیلی بیوی

ہمارے اِک پڑوسی نے ابھی کی دوسری شادی
ہے اُن کا بیٹا چنو جس کی ماں وہ بیوی پہلی ہیں
لگے کہنے میاں چنو، میں اب سمجھا، میں اب سمجھا
مِری سوتیلی امی، ابو کی سوتیلی بیوی ہیں!

کرن خان

قسطوں قسط

پہلی قسط

میں اور میرا سرجری وارڈ

تقریباً پانچ سال پرانا قصہ ہے، جس نے زندگی کے ایک نئے پہلو کو مجھ پر روشناس کیا۔ بہت سی حقیقتیں عیاں ہوئیں اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ تو آیئے آپ کو بھی وہ پہلو کھول کر دکھاتے ہیں۔ چلئے میرا ہاتھ پکڑیے تا کہ ماضی میں داخل ہو جائیں۔

بیس اکتوبر کی درمیانی شب۔۔۔ میں ٹی وی لاونج میں اپنا من پسند ٹاک شو اپنے پیارے ابو جی کے ساتھ دیکھ رہی تھی کیونکہ سیاست میں ہم باپ بیٹی کی مشترکہ دلچسپی تھی لیکن اس وقت ہماری مخالف اور امی کی فیورٹ جماعت کی تعریفیں چل رہی تھیں سو ہم باپ بیٹی دیکھنے پر مجبور تھے۔ مجھے بیٹھے بیٹھے کمر میں عجیب سا درد محسوس ہوا۔ ویسے تو یہ درد چند دنوں سے محسوس ہو رہا تھا لیکن میں نے توجہ نہ دی تھی۔ آج البتہ شدت زیادہ تھی۔ میری شکل پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے اور میں نے امی کو پکارا۔

امی نے میری طرف دیکھا اور بولیں ’’ٹھیک ہے، یہ حکومت تم کو پسند نہیں لیکن اس میں رونے والی کیا بات ہے۔۔۔ تمہاری ذاتی کیا دشمنی ہے؟‘‘

’’امی۔۔۔!‘‘ میں نے تکلیف کو بمشکل دباتے ہوئے پھر پکارا۔۔۔ ’’امی مجھے درد ہو رہا ہے، بہت پیٹ میں۔‘‘

اِس بار امی کے چہرے پر تشویش جھلکی۔ امی ابو پریشانی سے میری طرف آئے۔

’’کیا ہوا؟ کہاں درد ہے؟؟‘‘

میں نے پیٹ کی طرف اشارہ کیا ’’امی پورے پیٹ میں ہے مجھے سمجھ نہیں آ رہی، کہاں ہے۔‘‘

اُس وقت تو پین کلرز دے دی گئی۔ طے یہ ہوا کہ کل ہسپتال چل کر چیک اَپ کراتے ہیں۔۔۔ مجھے بھی پین کلرز کے بعد وقتی طور آرام آ گیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے ہم ہسپتال موجود تھے۔ابو امی میرے ساتھ تھے۔میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی اس لیے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ماں باپ کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔ڈاکٹر کے آنے میں ذرا دیر تھی اور میرا چپ کر کے بیٹھنا محال تھا،لہٰذا اٹھ کھڑی ہوئی اور باری باری اُس ویٹنگ روم میں مریضوں کا حال پوچھنے لگی۔

پہلے نمبر پر ایک عورت جو میرے ساتھ بیٹھیں تھیں، اُن کا حال پوچھا۔خدا جانے سانپ کھا کر آئی تھیں یا شوہر سے لڑ کر۔۔۔سخت ناگواری سے مجھے دیکھا اور بولیں ”تمہیں کیوں بتاؤں مجھے کیا بیماری ہے۔“

میں سٹپٹا گئی اور جواب میں دفاعی انداز اختیار کر کے کہا ”بس آنٹی ویسے ہی پوچھ لیا۔۔۔آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے نا۔۔۔“

اِس بات پر ان کی شکل مزید بگڑ گئی اور مجھے باقاعدہ ڈانٹنے کے انداز میں جھاڑا ”یہاں کوئی ولیمہ چل رہا ہے کیا؟ ظاہر ہے بیمار ہوں تو آئی ہوں۔“

مجھے اندازا ہو گیا یہ محترمہ کسی صورت بیماری شو نہیں کرائیں گی اللہ جانے کیا مرض تھا۔میری مزید کریدنے کی جرات نہ ہوئی۔امی کی طرف دیکھا تو سخت ناراضگی سے گھوری مارے تھیں ۔۔۔مقصد مجھے روکنا تھا کہ اب کسی کا حال نہ پوچھنا لیکن وہ کرن ہی کیا جو رک جائے۔۔۔میں اٹھی ایک اور عورت کے پاس چلی آئی اور پوچھا ”آپ کو بیماری ہے آنٹی؟“

آنٹی نے میری طرف دیکھا اور پیٹ کہ طرف اشارہ کیا۔۔بولی کچھ نا۔۔میں نے دو اندازے لگائے۔ایک یہ کہ محترمہ گونگی ہیں دوسرا اُن کے پیٹ کے سائز سے لگا کہ ماں بننے والی ہیں۔اب سوچا کہ گونگوں کو مبارک کیسے دی جاتی ہوگی۔بہت سوچا لیکن کچھ سمجھ نہ آئی۔۔۔خیر بے بسی سے ہنس پڑی اور ان کا کندھا تھپتھپایا۔اتنے میں ایک مرد آیا ان کے ساتھ بیٹھ گیا، میں نے اس سے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا ”میری طرف سے ان کو مبارکباد دے دیں مجھے پتہ نہیں ہے کہ گونگوں کو مبارک کیسے دیتے ہیں۔۔۔“میں نے ساتھ ہی وضاحت بھی دے دی۔

وہ بندہ جو شکل سے پٹھانوں والے نقوش رکھتا تھا، تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا اور اسی تعجب سے بولا ”او ماڑا کس چیز کی مبارک اور کون گونگا ہے؟“

میں اِس سچوئشن پر تھوڑی گڑبڑا سی گئی لیکن دوبارہ وضاحت دینا مجبوری تھی سو لجاجت سے بولی ”بھائی اپنی وائف کو مبارک دی دیں اُنہوں نے اشارہ کر کے بتایا ہے مجھے خوشخبری کا۔“

بندے نے میری اس بات پر تڑپ کر عورت کو دیکھا اور غالبا پشتو میں عورت سے کچھ پوچھا۔عورت نے اپنے برقعے سے ہی کچھ کہا جو کہ ظاہر ہے مجھے سمجھ نہ آیا لیکن یہ پتہ چل گیا کہ عورت گونگی نہیں تھیں تاہم اُردو نہ آتی تھی شاید ان کو۔۔۔میں شرمندہ ہو گئی کہ اب کیا صفائی دوں۔اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی، بندہ انتہائی سخت تاثرات چہرے پر سجا کر بولا ”بی بی یہ ہمارا والدہ ہے اور ان کا اپینڈکس کا آپریشن ہونا ہے۔“

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔نظر ملانے کی جرات نہ ہوئی۔شرمندگی سے معذرت کرتی واپس اپنی سیٹ پر آ گئی۔امی مجھے کینہ توز نظروں سے گھورے جا رہی تھیں، ابو البتہ ہنسی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

اب مزید کسی کا حال پوچھتی تو امی سے درگت بنواتی اور سچ پوچھیں تو اب شرم کے مارے سر جھکا کے بیٹھی رہی۔

اللہ اللہ کر کے ڈاکٹر صاحب آ گئے۔۔۔میرا نمبر آ گیا۔الٹراساونڈ ہوا۔۔۔ڈاکٹر صاحب نے چند اور ٹیسٹ کروائے اور دو تین گھنٹے کے بعد جو رپورٹ آئی وہ ہمارے ہوش اڑانے کو کافی تھی۔

ڈاکٹر کے ہاتھ میں میری رپورٹ تھی اور چہرے پر سنجیدگی جس میں، تھوڑی تھوڑی تشویش شامل ہو چکی تھی۔

”از ایوری تھنگ او کے؟“ ابو نے دریافت کیا۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا۔معاملہ میرا تھا لہٰذا باوجود بہادر بننے کی کوشش کے، میرے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔اب کی بار ڈاکٹر صاحب نرمی سے مسکرا دئے اور شفقت سے

بھر پور انداز میں ابو سے مخاطب ہوئے ''بچی کو ایڈمٹ کرا دیں۔۔۔ایک معمولی سا مسئلہ ہے جس کے لیے چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔''

گو کہ اُنہوں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ سرجری کو کم سے کم خطرناک بنا کر دکھائے لیکن آپریشن کا لفظ سن کر ہی میرے اور امی کے چہروں سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔امی نے متوحش ہو کر ابو کو دیکھا ''کیا ہوا میری بچی کو؟''

ابو بھی یہی سوال ڈاکٹر سے کرنا چاہتے تھے اس لیے سوالیہ شکل سے ڈاکٹر کو دیکھا۔اب کی بار ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی سی پروفیشنل شکل بنالی اور میکانکی انداز میں سمجھانے لگے،جس کا لب لباب یہ تھا کہ آنتوں میں کوئی انفیکشن ہوگیا ہے لہٰذا آپریٹ کر کے وہ انفیکشن والا حصہ ریموو کرنا ہوگا۔

امی پھر دہشت زدہ ہوگئیں ''کیا مطلب آنتوں کا کچھ حصہ نکال لیا تو چھوٹی نہ ہو جائیں گیں؟''

ڈاکٹر صاحب نے اب کی بار امی کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے دوبارہ نرم لہجہ اختیار کیا ''نہیں آنتیں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ اگر ایک چند سینٹی میٹرز کا ٹکڑا نکال دیا جائے تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔''

اور اس کے ساتھ ہی ابو کی طرف رخ موڑا ''آپ لوگ جلد سے جلد داخلہ بنوا کر بچی کو ایڈمٹ کرائیں۔آپریشن جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔''

ابو جی نے آخری سوال کیا ''آپ کا آپریشن ڈے کب ہو گا؟''

''پرسوں!'' ڈاکٹر کا جواب آیا ''اور یہ بچی میری آپریشن ٹیبل پر موجود ہونی چاہیے۔'' ڈاکٹر صاحب نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔

یہ دیکھنے کی دیر تھی میری رہی سہی جان بھی نکل گئی اور بہت خوف محسوس ہوا ان ڈاکٹر صاحب سے۔میں نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے آواز نکالی اور ابو کو پکارا ''ابو جی ابھی تو گھر چلیں۔۔۔''

ابو بھی میرا خوف بھانپ چکے تھے لہٰذا ڈاکٹر سے آنکھوں ہی آنکھوں میں وعدہ کیا۔۔۔مجھے داخل کرانے کا۔ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر امی اور مجھے مشترکہ تسلی کرائی۔جس کو بد دلی سے سنتے ہوئے ہم باہر آگئے۔

کاریڈور سے گزرے۔ہم چلتے چلتے گاڑی تک آگئے لیکن تینوں چپ تھے کیونکہ امی اور میں تو صدمے تھے۔ابو کے چہرے پر البتہ پریشانی کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی تھی اور وہ تھا حوصلہ جواب انھوں نے ہم کو بھی دلانا تھا۔بے شک ایک باپ سے بڑھ کر حوصلہ مند مضبوط چٹان نہیں ہوگی اس زمانے میں۔اولاد کی خاطر ہر مشکل سے نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ابو نے سب سے پہلے شروعات کی ایک پانچ نکاتی بیان کے ساتھ ''دیکھو بیٹا! آج کل کے جدید دور میں سرجری کوئی خطرناک ایشو نہیں رہ گئی۔معمولی سا آپریشن ہوگا۔۔۔''

''آپریشن اپریشن ہوتا ہے خان صاحب یہ معمولی کیا ہوتا ہے؟ چیر پھاڑ آپ کو معمولی لگتی ہے؟؟'' امی کا پریشانی سے بھر پور جواب آیا۔

ابو نے اگلا نقطہ اٹھایا ''اللہ کا شکر ادا کرو تم لوگ کہ ہمیں پہلے پتہ چل گیا۔۔۔ ورنہ اس سے زیادہ خطرناک صورت حال بھی ہوسکتی تھی۔''

امی اب کی بار اُداسی سے بولیں ''کیا پہلے پتہ چل گیا۔اس سے زیادہ برا کیا ہوسکتا تھا آپریٹ تو اب بھی ہو رہا ہے اور آپریٹ سے برا کیا ہوگا؟''

ابو نے اب کی بار امی کو گھورا کہ امی اس رائے کا اظہار میرے سامنے نہ کریں اور ساتھ ہی میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔

''تم تو میری سب سے بہادر اولاد ہو۔۔۔میری بیٹی ذرا بھی پریشان نہیں ہے دیکھ لو۔''

میں ابو کے اس حسن ظن سے بہت محبت کرتی تھی۔لہٰذا زبردستی تھوڑی سی مسکراہٹ چہرے پر جمالی۔

امی نے پھر سے بات کاٹ دی ابو کی اور جواب دیا ''بہادر

بیٹی ہے تو کیا اب اس کا پیٹ کٹواو گے؟ اِس کو بہادر ہونے کی سزا دلواؤ گے؟؟''

ابو نے سخت بدمزگی سے امی کو دیکھا'' کمال کرتی ہو میں کیوں کٹوانا چاہوں گا؟ سنا نہیں تھا تم نے کہ آپریشن جلد سے جلد کرانا ہے اور یہ ''پیٹ کٹوانا'' کیا ہوتا ہے؟ سرجری ہے ۔۔۔ معمولی سی دو چار دن میں ٹھیک بھی ہو جاتی ہے بچی۔''

امی نے درمیاں میں ہی اپنی بات شروع کر دی'' معمولی معمولی ایسے کہہ رہے ہیں آپ جیسے روز صبح شام آپ کا یہ آپریشن ہوتا ہو۔ میری بچی کو کاٹ پیٹ کر پتہ نہیں کتنے دن رکھیں گے۔''

اب کی بار وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ ابو کو آس بھری نظروں سے دیکھا'' کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم علاج کروائیں ؟ سرجری کی ضرورت نا ہو؟''

ابو کا سر نفی میں ہلا ''نہیں ڈاکٹر صاحب نے جو کہا ہمارے بھلے کے لیے کہا اور ہمیں ویسا ہی کرنا ہوگا۔''

امی نے یہ سن کر ڈبڈباتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ جس طرح ماں باپ اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ اولاد کے لیے بھی ماں باپ کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

ہر قسم کی صورت حال میں خود کو کمپوز کر لینا اور اگلہ لائحہ عمل سکون سے ترتیب دینا ۔۔۔ یہ دو چیزیں ابو کی طرف سے ملی ہوئی ہیں۔ جتنی دیر امی پریشانی کا اظہار کرتیں رہیں اور ابو ان کی دل جوئی کا ۔۔ میں اتنی دیر میں خود کو اگلے وقت کے لیے تیار کر چکی تھی۔ اب جو بھی ہو ماں باپ کو رو دھو کر مزید پریشان نہیں کرنا تھا۔ میں نے کھنکھار کر ان دونوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔

دونوں چپ ہو گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔ میں مسکرا اٹھی۔ دل ہی دل میں ان کے لیے سینکڑوں دعائیں کر ڈالیں اور شرمندہ بھی ہوئی کہ کچھ بھی ہو، اُن کی پریشانی مجھ سے زیادہ تھی۔ قربان جایئے ایسے ماں باپ میسر ہوں اور کیا چاہیے۔ ان کے لیے میں اپنی پریشانی کو آرام سے دفن کر سکتی تھی۔

> ایک بار خواجہ حسن نظامی نے ڈپٹی نذیر احمد سے پوچھا ''حضرت پردے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟''
> ڈپٹی صاحب بولے ''کس کے پردے کے متعلق جواب دوں؟ زمانہ وہ آ گیا ہے کہ اب تو لڑکوں کو بھی پردہ کرنا چاہیئے۔''

میں ازلی شگفتگی سے گویا ہوئی'' یار! یہ کیا واویلا مچایا ہوا ہے امی جی؟ کیا مجھے کینسر ہو گیا ہے؟ یا کوئی لا علاج مرض لاحق ہو گیا ہے؟؟''

امی نے ہول کر میری بات کو کاٹ دیا'' اللہ نا کرے ۔۔۔ زبان تو تمیز سے استعمال کرو۔''

اگر اس وقت میری پریشانی نہ ہوتی تو امی میری اس بات پر اس سے بھی زیادہ صلواتیں سناتیں۔

میں نے پھر سلسلہ کلام جوڑا'' ابو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔۔۔ کچھ بھی نہیں ہوگا مجھے ۔۔۔ اور مجھے کوئی بھی پریشانی نہیں ہے۔'' ساتھ ہی ابو کو مخاطب کیا ''ہم کل آ رہے ہیں ابو داخل ہونے ۔۔۔ آپ ٹینشن نہ لیں۔''

ابو نے متشکر ہو کر مجھے دیکھا کیونکہ امی کی تشویش ختم تو نہیں لیکن کم ضرور ہو گئی تھی اور یہ ہماری بھول تھی۔

راستے میں کال آئی بڑے ماموں کی کہ دیر ہو گئی کیا وجہ؟ اور ابو نے کہا'' گھر آ کے بتاتے ہیں۔''

ماموں نے کہا'' امی سے بات کرنی ہے۔''

ابو نے موبائل اُنہیں تھما دیا۔ امی نے ماموں سے گلوگیر لہجے میں کہا'' لالہ کرن دا آپریشن اے پرسوں۔''

آگے سے ماموں نے پتہ نہیں کیا پوچھا، امی نے کہا'' اساں آ رہے ہاں فی الحال گھر ۔۔۔ تساں آ جاؤ گھر لالہ۔''

اور شدت غم سے فون بند کر دیا۔

اب اگلا سین میں بغیر دیکھے بتا سکتی تھی کہ کیا ہونے والا تھا۔ ماموں لوگ سب کام چھوڑ کر بھاگم بھاگ آ گئے ہوں گے۔ مامیاں بھی ساتھ آ جائیں گی شوہروں کی پریشانی دیکھتے ہوئے خالائیں بھی'' ہائے ہماری بچی'' کی گردان کر رہی ہوں گی۔

اب میں نے شیشے کے ساتھ سر ٹکا دیا کیونکہ چند لمحوں بعد مجھے سب گھر والوں نے خودترسی کا شکار کرنا تھا۔

گھر آ گیا۔ جیسے ہی گاڑی رُکی، گیٹ میں سے دو بڑے ماموں نکلے۔ امی اپنے بھائیوں کو دیکھ کر غم سے بھر گئیں اور ماموں جلدی سے آگے بڑھے۔ تب تک میں سب سے پہلے گاڑی سے باہر نکل آئی۔ بڑے ماموں نے مجھے اپنے بڑے بڑے بازو پھیلا کر دونوں بازؤں سے پکڑ لیا۔

''میڈی دھی نو کیا ہو گیا بی بی؟''

میں چپ چاپ ماموں کے ساتھ اندر جانے لگی اور ساتھ ہی سوچتی جا رہی تھی کہ ہمارے خاندان کے مرد اِن نایاب قسموں میں شامل ہیں جو بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں سے پیار کرتے ہیں۔

باہر جتنے مرضی سخت رعب داب والے ہوں، گھروں میں داخل ہوتے ہی پگھل کر موم ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کی نظریں سب سے پہلے بیٹیوں کو تلاش کرتی ہیں اور یہ محبت ہی تھی جو آج ان ماموؤں کی آنکھوں سے تشویش کی صورت جھلک رہی تھی۔

صحن میں داخل ہوتے ہی اگلا منظر دیکھ کر پہلی بار مجھے بھی تشویش محسوس ہوئی۔ تین چارپائیاں لان میں نچھائے پڑی تھیں۔ ایک پر بستر وغیرہ ڈالا ہوا تھا۔ ساتھ میز پڑی تھی جس پر پھل اور جوسز وغیرہ تھے۔ مجھے پتہ چل گیا یہ بندوبست مجھ مریض کے لیے ہوا پڑا تھا۔

چند کرسیاں پڑی تھیں آنے جانے والوں کے لیے۔ اردگرد سے مامیاں کھڑیں تھیں سارا انتظام سنبھالے ہوئے۔۔۔اور بہنوں کے دہشت زدہ چہروں سے ہی اندازہ ہو گیا مجھے کہ ان کو ہر وہ واقعہ سنا دیا گیا ہے جس میں آپریشن کے دوران مریض خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔ اسی لیے وہ مجھے دیکھتے ہی انتہائی دردیلے انداز میں میری طرف لپکیں ''آپی ی ی ی۔۔۔''

مجھے اِس صورت حال نے کافی بدحواس کر دیا لیکن فوراً سے پیشتر خود کو سنبھال لیا ورنہ حالات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ میں یہ سب دیکھنے کے بعد لڑکھڑاتی ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو جاتی۔ ابو ماموؤں کو سرجری کی نوعیت بتانے لگے اور امی مظلوم سی شکل بنا کر دو خالاؤں کے درمیان بیٹھ گئیں اور وہ مجھ سے ملنے کے بعد امی کو تسلی دینے لگیں۔

میں اِس سارے فیز سے خود کو گاڑی میں ہی نکال چکی تھی۔۔۔لہٰذا آرام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک جوس کا ڈبہ اٹھایا اور پینے لگی۔

بڑی مامی مجھ سے مخاطب ہوئی ''بیٹا یہاں آؤ۔۔۔اس بستر پر بیٹھ کر پیو۔۔۔کرسی سخت ہے، بے آرامی ہو گی بیٹھنے میں اور درد نہ پڑ جائے۔''

میں نے بدمزگی سے اُنہیں دیکھا ''مامی مجھے کچھ نہیں۔۔۔میں بالکل ٹھیک ہوں، کس لیے سو جاؤں؟''

بہن بھائیوں نے مجھے گھیر لیا اور ایسے دیکھنے لگے کہ مجھے اپنا آپ متوقع مرحوموں میں محسوس ہونے لگا۔

میں نے ڈانٹا ''کیا ہے؟ کیوں گھور رہے ہو مجھے؟؟''

اس سے پہلے کہ بہنیں آبدیدہ ہو کر مجھ سے لپٹ جاتیں، میں اٹھی اور واش روم کی اجازت چاہی۔

ایک مامی اٹھ کھڑی ہویں۔ ''آؤ میں لے چلوں۔''

میں نے ماحول کی سنگینی کم کرنے کے لیے ایک جاندار سا قہقہہ مارا اور کہا ''حد کرتی ہیں آپ مامی۔۔۔ایسا کرو ایک وہیل چیئر بھی منگا لو۔۔۔اسی کی کمی ہے بس۔''

اس کے ساتھ ہی میں اندر کمرے میں داخل ہو گئی۔

پڑھنے والوں کو شاید محسوس ہو لیکن یہ لوگ کوئی اوور ایکٹنگ نہیں کر رہے تھے۔ یہ اتنے ہی نہیں اس سے بھی زیادہ حساس ہیں اپنی بیٹیوں کے لیے۔

میں نے واش روم آنے کے بعد منہ دھویا۔ اعصاب کو ریلیکس کرنا چاہا۔ جو بھی تھا، پہلی بار اس تجربے سے گزر رہی تھی جس کو سرجری کہتے ہیں بلکہ نہیں ''آپریشن'' لفظ زیادہ ڈراؤنا ہے۔ لیکن میرے اندر جو بھی اتھل پتھل ہو، ایک بات طے تھی کہ شو نہیں کرانی میں نے۔ کچھ دیر بعد باہر نکلی بہنیں موجود تھی دروازے پر۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ایک بولی ''آؤ! آپ کو پکڑ کر لے چلوں۔''

میں نے گھور کے دیکھا ''کیا تماشہ ہے یار کیوں پکڑو گی؟ چلو جاؤ چائے بناؤ میرے لیے اچھی سی۔۔۔''

ایک بہن مجھے اسی الوداعی انداز میں دیکھتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ دوسری نے میرے روکنے کے باوجود میرا بازو تھام لیا۔

باہر جو ماحول بنا ہوا تھا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

میرے وہاں پہنچنے پر سب متوجہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

ایک ماموں بولے ''بچی کو پھل کاٹ کر کھلاؤ بیگم!''

مامی میری طرف آئیں اور ساتھ بیٹھ کر سیب کاٹنے لگیں۔

دوسرے ماموں بولے ''بیٹا! کچھ کھانا ہو تو بتاؤ، میں شہر جا رہا ہوں لیتا آؤں گا۔''

میں نے انکار میں سر ہلایا ''نہیں ماموں۔''

ایک خالہ اُٹھیں ''میں اس کے لیے حلوہ بناتی ہوں۔''

میں نے بے زاری چھپاتے ہوئے اُن کو دیکھا ''خالہ حلوہ کس لیے؟''

''بیٹا! آنتوں کا مسئلہ ہے، ایسی چیز کھاؤ جو آرام سے ہضم ہو جائے۔۔۔ تکلیف نا ہو۔''

سب نے اتفاق کیا۔

مامی جو سیب کاٹ رہی تھیں، اب چھلکا بھی اتارنے لگیں اور بولیں ''میں بھی اس کی فروٹ چاٹ بنا لیتی ہوں تا کہ سخت نہ لگے۔''

چھوٹی بہن کے بارے میں پوچھا گیا کہ کہاں گئی۔ میں نے بتایا کہ چائے بنانے گئی ہے میرے لیے۔

چند تشویش بھری آوازیں ابھریں۔

''کیا چائے پلانا ٹھیک ہوگا؟''

''خون نا جلا دے گی چائے؟''

''چائے کی بجائے دودھ سوڈا نا بنا دیں؟''

میں نے سخت عاجز ہو کر ابو کی طرف دیکھا۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔ بچی کو چائے ہی لا دو۔۔۔ کسی چیز سے نہیں روکا ڈاکٹر نے۔''

اب کی بار با دلِ نخواستہ سب چپ ہو گئے۔

اِتنے میں بھائی نے آ کے اعلان کیا ''پھوپھو اور چاچو آ رہے ہیں۔''

''اوہ نو۔'' میں نے سر تکیے پر ڈال دیا اور شدت سے کل کا انتظار کرنے لگی کہ اس ماحول سے نکل کر ہسپتال ہی چلی جاؤں کیونکہ یہ ماحول مجھے وحشت میں مبتلا کر رہا تھا۔

رات دس بجے تک ان رشتے داروں کی مسلسل تیمارداری کے بعد میں تھک ہار کے سو گئی۔

دوسرے دن صبح تیار ہو کے سب سے پہلے جا کے گاڑی میں بیٹھ گئی کیونکہ اب جذباتی سین آنا تھے اور مجھے کمزور نہیں پڑنا تھا۔ امی ابو مع کچھ سامان کے آ کر گاڑی میں بیٹھے۔ رشتے داروں نے الوداعی دعائیں دیں۔ میں نے مسکرا کر سب کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا اور بھائی سے کہا گاڑی سٹارٹ کر دو۔

اُس نے حکم کی تعمیل کی اور بیس منٹوں بعد ہی ہم ہسپتال کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ اس تمام راستے میں ابو اور میں امی کو تسلیاں دیتے آئے۔

داخل ہونے کے بعد آدھا دن تو مختلف اقسام کے ٹیسٹ کرانے میں گزرا۔

شام تک ہم سارے ٹیسٹ مکمل کروا کر اپنے وارڈ میں داخل ہوئے، جہاں ایک بستر میرا منتظر تھا۔ (جاری ہے)

کرن خان کا تعلق بہاولپور سے ہے۔ فی الحال حصولِ علم میں مگن ہیں۔ سیاسیات ان کا مضمون ہے۔ کہانیاں لکھنے لکھانے کا بہت شوق ہے، جو عموماً فکاہی رنگ لئے ہوئے ہے۔ پیشہ وارادیبہ بننے کا شوق ہے۔ اِن کی کہانیاں عموماً طویل ہوتی ہیں لیکن ایسی جامعیت لئے ہوئے ہوتی ہیں کہ طوالت کے باوجود پڑھنے والا ایک ہی نشست میں پوری کہانی پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ طرزِ تحریر خاصا شستہ و شگفتہ ہے۔ نہایت بے تکلفی اور بیساختگی سے ہر بات کہہ جاتی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔

حافظ مظفر محسن

پانچ کروڑ لے لو!

اُس نے میوزک آن کر دیا۔ میں نے USB نکال دی اور ریڈیو پر FM تلاش کرنے میں مصروف ہوگیا۔ اس دوران اُس کے چہرے پر ناگواری میں نے محسوس کر لی تھی لیکن اچانک ریڈیو پر عاطف اسلم کی قوالی ''تاج دارِ حرم'' پر ریڈیو کی سوئی رک گئی، وہ خوش ہوگئی۔

''فاطمہ! سچ بتاؤ اس صبح سے پہلے کی رات کو انجوائے کر رہی ہو، ہمارے اس خطے کا میوزک تمہیں اچھا لگتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے محبت والے یہ حب رسول سے سرشار اشعار؟''

''میوزک تم سیکھتے رہے ہو اور یہ ٹیکنیکل سوال مجھ سے کر رہے ہو!'' وہ ہنستے ہوئے بولی ''اور ہاں تم یہ تو جانتے ہو میں قصور سے ہوں تو میوزک Lover تو میں ہوں لیکن قوالی مجھے ہمیشہ سے پسند ہے اور اگر اوٹ پٹانگ زندگی گزارنے سے میں باز آگئی یا اندھیرے سے روشنی کی طرف کبھی سفر کرنا پڑا تو اس کے پیچھے میرے اندر چھپا مذہبی انسان ہی ہوگا۔'' وہ قوالی ختم ہونے پر بولی۔

''گویا یہ تمہارا پالیسی بیان ہے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ رات کے پچھلے پہر ریڈیو پر براڈ کاسٹر نے فرحت عباس شاہ کی غزل پڑھنا شروع کی ۔

لوٹ آئے نہ کسی روز وہ آوارہ مزاج
کھول رکھتے ہیں اِسی آس پہ در شام کے بعد
تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دُکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اتر شام کے بعد

''یہ فرحت عباس شاہ نے شاعری کیوں چھوڑ دی؟'' وہ بولی ''یار بات سنو یہ فرحت عباس شاہ سے میری محبت ہے وہ الٹے پلٹے کام بھی کر جاتا ہے لیکن میں تو اُسے ہر حال میں روکنا چاہتا ہوں ''خبرناک'' میں ''ماسٹر جی'' کا رول کیا تو پورا پاکستان مجھے کوسنے لگا کہ شاہ کو

ڈرائی ڈن کو نہایت لڑاکا بیوی سے پالا پڑا تھا چنانچہ اس کے مر جانے پر ڈرائی ڈن نے اس کی قبر پر یہ الفاظ کندہ کرائے ''اِس قبر میں ڈرائی ڈن کی بیوی آرام کر رہی ہے اور اس کی وفات کے بعد ڈرائی ڈن کو بھی آرام نصیب ہوا ہے۔''

روکو'' ایک عظیم شاعر کے یہ شایانِ شان نہیں کہ مسخرہ پن کا مظاہرہ کرے اور لوگ اُن کا مذاق اڑاتا پھرے! میں نے سب دوستوں کو صفائی پیش کی اور جب شاہ صاحب سے بات ہوئی تو وہ بولے'' روٹی روزی کا بھی تو سوچنا ہے۔'' تمہیں یاد ہے اک بار میں نے تمہیں تفصیل سے بتایا تھا کہ فرحت عباس شاہ کے ادارے کے تحت ہی مشہور زمانہ کتاب'' پارلیمنٹ سے بازارِ حسن تک'' شائع ہوئی تھی اور بہت سی عدالتوں میں لوگوں نے کتاب اور پبلشر کو خوب گھسیٹا بھی تھا مگر کتاب چھپتی رہی پبلشر بھی کام کرتا رہا۔ اصل میں'' پارلیمنٹ سے بازارِ حسن تک'' میں کسی کی تحریر نہ تھی، وہ تو خبروں کے تراشے تھے جو یکجا کر کے ظہیر بابر کے نام سے مارکیٹ میں آئے جب عدالتوں میں جانا ہوتا تو فرحت عباس شاہ مطمئن ہوتا کیونکہ پہلی ہی پیشی پر جہاں کروڑوں کے ہرجانے کا دعویٰ تھا وکیل نے بتایا کہ یہ تو خبروں کے تراشے ہیں، مختلف اخبارات کے تراشے پیش ہوئے تو معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔''

'' سنا ہے کافی عرصہ تک تمہارے اس فرحت عباس شاہ کی روٹی روزی اس کتاب'' پارلیمنٹ سے بازارِ حسن تک'' سے ہی چلتی رہی ہے یا پھر اُن کی ہٹ غزل'' شام کے بعد'' اُن کی نوجوان نسل میں پذیرائی کا باعث بنی؟''

میں ہنس پڑا۔ اُس کے بھی قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

'' ویسے کیسا مضحکہ خیز نام ہے اس کتاب کا!'' وہ بولی

'' اصل میں فرحت عباش شاہ کی مشہور زمانہ کتاب'' شام کے بعد'' نے اُسے شہرت بھی دی اور سہارا بھی۔۔۔ بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی کتاب آپ کا سہارا بن جائے!'' میں نے بتایا '' ہمارے ہاں ابھی تک ایسا لٹریچر کسی نہ کسی بہانے چھپتا رہتا ہے اور عوام میں مقبول بھی ہے۔ کوکا پنڈت کی ہندی کتاب کا ترجمہ

'' کوک شاستر'' بھی عوامی سطح پر بے حد سیل ہوتا ہے اور ہاتھوں ہاتھ بکتا بھی ہے، مجھے اس لیے اس بات کا پتہ ہے کہ میرے دوست باؤ طارق کے Father '' باؤ جی'' کے پریس پر اک دور میں سارا سال ردی کاغذ پر یہ کتابچہ'' کوک شاستر'' ہی چھپتا رہتا تھا۔۔۔ ویسے کمپیوٹر میری مراد۔۔۔ انٹرنیٹ۔۔۔ فیس بک کے ہوتے ہوئے اس قسم کے فحش لیٹریچر کی بھلا اب کیا اہمیت ہے؟ خلیل جبران کی شہرۂ آفاق تصنیف Broken Wings بھی تو دنیا بھر میں اُس کی شہرت کا باعث بنی اور صدیوں پر محیط شہرت ''خلیل جبران'' کے حصے میں آ گئی۔

'' سنا ہے تم نے اور شاہ نے مل کر پارٹ ٹو بھی چھاپا تھا اس کتاب کا؟ میری مراد'' پارلیمنٹ سے بازارِ حسن تک'' ہے۔''

'' ہاں ہاں۔۔۔ لیکن عوام میں اُس کو پذیرائی نہ مل سکی۔ اصل میں اُس وقت تک شاہ کی ہستی مزید متنازعہ ہو چکی تھی۔ میں نے تو سو بار نہیں ہزار بار منع کیا تھا'' شاہ جی۔۔۔ علی نواز شاہ کے ناول '' گروماں'' کا ٹائٹل بدل دو۔۔۔ یہ ٹائٹل پر احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، عطاء صاحب کا Spetch'' واہیات'' انداز میں بنانا بری بات ہے۔ لوگ اُن پر تو ہنسیں گے ہی لیکن مذاق ہمارا بھی تو اڑایا جائے گا۔ بھائی گل فراز نے بھی'' گروماں'' کا ٹائٹل تبدیل کرنے کو کہا تھا، جس طرح کا یہ ناول تھا اُس نے علی نواز شاہ کو ادب کے آسمان پر پہنچا دینا تھا مگر متنازعہ ٹائٹل اُس کتاب کی جڑوں میں بیٹھ گیا اور وہ کتاب دو ایڈیشن چھپنے کے بعد'' سو'' گئی، حالانکہ ایسی کتابیں بہت مقبولیت حاصل کرتی ہیں اور اُن کے لکھاری اُن کتابوں کی وجہ سے علم و ادب کی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس سے پہلے علی نواز شاہ کی کتاب'' کالک'' پڑھنے والوں میں بے حد مقبول ہوئی کیونکہ اس کا موضوع بھی'' گروماں'' کی طرح Unique تھا۔ علی نواز شاہ نے آج تک جتنے بھی ناول لکھے پوری تحقیق اور جستجو کے بعد ہی لکھے۔'' کالک'' اُن میں سر فہرست تھا جو جدید ترین جنسی سکینڈلز کے حوالے سے ایک مستند کتاب تھی۔

'' یہ علی نواز شاہ سرکاری ملازم ہے خبریں بھی پڑھتا ہے۔۔۔

تمہارے عطاء الحق قاسمی صاحب نے جب وہ چیئرمین PTV بنے اُسے کیوں نہیں نکالا PTV سے؟"

"فاطمہ! یہ عطاء صاحب بنیادی طور پر خوش مزاج انسان ہیں یہ شخص نہ تو لالچی ہے نہ ہی لڑاکا مزاج لیکن جب یہ بندہ کسی کے خلاف ہوتا ہے تو پھر اُس کا پیچھا بہر حال کرتا رہتا ہے اور مجھے بیک وقت یہ دونوں اس لیے پسند ہیں کہ "یاروں کے یار ہیں" انتظار حسین "منو بھائی" اداس نسلوں کے خالق، کیا نام ہے اُن کا؟! اور ایسے ہی سینئر لکھاریوں کو سنبھالنا، آخری عمر میں اُن کی عزت بنائے رکھنا، اُن کو Due respect دینا، یہ عطاء الحق قاسمی کا ہی کام تھا، یہ عطاء الحق قاسمی کے خلاف فرحت عباس شاہ کی تحریروں اور چٹکلوں کے حوالے سے بات ہوتی رہتی ہے لیکن عطاء صاحب ہنس کے ٹال دیتے ہیں، اور مانتے ہیں کہ "حافظ صاحب آپ کا یہ دوست فرحت عباس شاہ بڑا اچھا شاعر ہے" عطاء صاحب کی عوامی سطح پر پذیرائی کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اِس بار یکم فروری ۲۰۱۸ء کو اُن کی سالگرہ "آواری ہوٹل" میں ہوئی تو تین چار سو چوٹی کے لوگ وہاں آئے اور محبت سے عطاء صاحب کو سالگرہ کی مبارکباد بھی دی حالانکہ اُس وقت وہ PTV کے GM نہیں رہے تھے اور اس بات کا سب کو پتہ بھی تھا اور آپ تو جانتے ہیں کہ لوگوں کو جب پتہ لگ جائے کہ فلاں شخص اب کسی اختیار والی پوسٹ پر نہیں رہا تو وہ ایسے یکدم منہ موڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے ہاں تو ایسے موقع پر خانسامہ بھی جانے والے یا اختیار والی پوسٹ چھن جانے والے کو جان بوجھ کر کھانے کے بعد "پھیکے" خربوزے کھلا کر اپنے کمینے پن اور لالچی ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔۔۔ یہ ہمارا کلچر ہے۔ یہ عباس تابش، فرحت عباس شاہ اور اعتبار ساجد ہی تھے جو باقی احمد پوری کے بعد مارکیٹ میں آج بھی مقبول ہیں اور جانے پہچانے جاتے ہیں ورنہ فیس بک کے دانشور اور شاعر عوام میں جگہ نہ بنا سکے اور بس؟ ویسے اب نہ جانے کہاں جا بسے وہ قادر الکلام شعراء کہ جو مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھے، جو لہک لہک کر اشعار پڑھتے اور عوام بھی ساتھ ساتھ جھومتے ہوئے اُن کی شعر گاتے اور ماحول کو گرماتے۔

ہم دونوں واقعی خوبصورت چھوٹی پہاڑیوں کے طلسم کا شکار تھے جب کبھی میں بھی ایسے سفر پر جاتا ہوں تو خوراک پر خصوصی توجہ دیتا ہوں بلکہ کھانا پینا، ہر چیز پر غالب آ جاتا ہے اور نیند کوسوں دُور!

"السلام علیکم!"

"شاہد صاحب آپ؟" میں نے سلام کا جواب دیئے بغیر پوچھا۔

"یہ سب اپنا ہی ہے!" شاہد نے ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا؟ "Take your time۔۔۔ میں آتا ہوں!!" شاہد بولا اور بڑی گاڑی سے اتر کر ریسٹورنٹ کی طرف چل پڑا سب ملازم اُس کے گرد جمع ہو گئے، وہ اُن میں کسی "باس" کی طرح لگ رہا تھا۔

"یہ وہی فراڈیا ہے ناں۔۔۔ ڈیفنس والا۔۔۔ جس نے تمہارا ایک کروڑ روپیہ investment کے چکر میں "ہڑپ" کر لیا تھا؟" فاطمہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

ہم دونوں اُس کو گھور رہے تھے اور شاہد بھی شاید یہ محسوس کر رہا تھا!

"نہایت چالاک اور مکار شخص ہے!" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں "طنز و مزاح" کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

امراضِ معدہ و جگر

امراضِ معدہ و جگر سے منسلکہ جس قدر چلبلاہٹیں ہیں، اِس مضمون میں اُن کی ذخیرہ اندوزی کرنی کی سعی ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

نظام ہضم

جس طرح شاعروں نے دل کو دماغ کی جگہ سوچنے اور سمجھنے کا کام سونپ دیا ہے اسی طرح ظریف شعرا نے نظام ہاضمہ سے بہت سے افعال منسوب کر رکھے ہیں۔ایک ماہرِ امراضِ معدہ کی تشخیصی فکر کسی شاعر کی تخیل پرواز تک کبھی نہیں پہنچ سکتی جس کا اندازہ آپ کو ذیل کے اشعار پڑھ کر بخوبی ہوسکتا ہے ۔

ہے سوءِ ہضم سے قائم مری راتوں کی رعنائی
جو معدہ ٹھیک ہو خواب پریشاں کون دیکھے گا

بیدل جونپوری

جب کبھی میرا نظامِ ہضم ہوتا ہے خراب
لازماً اس روز رکشے میں سفر کرتا ہوں میں

اسد جعفری

جب سے نہیں رہا ہے ترا ہاضمہ درست
''آتے ہیں پیٹ سے یہ مضامیں خیال میں''

صابر آفاقی

نویدِ مالِ کرپشن سے ہو شکم سیری
نظامِ ہضم مرا اس قدر خراب نہیں

نوید ظفر کیانی

ہاضمہ

حکیم صاحب ضعفِ معدہ سے کیا مراد لیتے ہیں اور مریض کے ضعف معدہ کہتا ہے یہ فی الحال ایلوپیتھک ڈاکٹروں کے لئے

عقدۂ لاینحل ہے۔ کہیں ہاضمہ کے خرابی سے مراد اسہال کی بیماری ہوتی ہے تو کہیں تیزابیت کو بھی ہاضمے کی خرابی کہہ دیا جاتا ہے۔ کہیں تبخیر کو اس سے تعبیر کیا جاتا ہے تو کبھی کھانے کا نہ ہضم ہونا ہاضمے کی خرابی تصور کیا جاتا ہے۔ مگر شعرائے ظرافت ضعفِ معدہ کی بہت سی نان میڈیکل وجوہات بھی دریافت کر چکے ہیں اور اشیائے خورد و نوش کے علاوہ کچھ اور چیزوں کو بھی کھانے کی چیزوں میں شامل کرتے ہوئے انہیں ضعفِ معدہ کا سبب قرار دیتے ہیں۔

میں نے کہا کہ پیار کا اظہار کیجئے
مائل ہمارے بیچ یہ کیسا حجاب ہے
جب یہ کہا وفا کی قسم کھایئے جناب
بولے کہ ان دنوں مرا معدہ خراب ہے

شوکت جمال

ضعفِ معدہ کی شکایت ہے مجھے
ایک گالی، خیر کھالی جائے گی

محمد الدین فوق

ماہرِ امراضِ معدہ

جب سے شعبہ طب میں تخصیص کا رجحان عام ہوا ہے جنرل میڈیکل پریکٹیشنر عنقا ہوتا جا رہا ہے۔اب ہر شخص اسپشلائیزیشن کے چکر میں مریض کو چکر دے رہا ہے۔ان ماہرین میں دو نمبر ڈاکٹر حضرات نے شامل ہو کر مریض کے اعتماد کو جہاں نقصان پہنچایا ہے بحیثیت مجموعی معاشرے میں بھی بے یقینی کی کیفیت پیدا کردی ہے اور مریض ہے کہ جھوٹے اسپشلسٹوں کی فیس دے کر معدہ کو مزید ضعیف کر رہا ہے۔

فیس

سوچا تھا یہ ملے گی شفا ہم کو دائمی
ماہر کے پاس اپنی مگر اِک نہیں چلی
معدہ بھی زخم زخم ہے اور جیب بھی فگار
''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فیس اِتنی لے رہا ہے ڈاکٹر بننے کے بعد
قتل ہی کرنے لگا ہے چارہ گر بننے کے بعد

نوید ظفر کیانی

امراضِ معدہ

یوں تو میڈیسن کے شعبہ میں بے شمار امراضِ معدہ ہیں جن کا احاطہ کسی مستند ڈاکٹری مقالے میں ہی کیا جاسکتا ہے۔مگر

ظریف شعرا نے جن امراضِ معدہ سے معجون ظرافت برآمد کی ہے وہ بھی کچھ کم نہیں۔ڈاکٹر محمد محسن جو جو بذات خود میڈیکل

ڈاکٹر ہیں اور مزاح نگاری کا سائیڈ بزنس بھی سرانجام دیتے ہیں، کا قول ہے کہ ''بچوں کے ڈاکٹر کو چھوٹے بچوں کا پیٹ دبانے سے احتراز کرنا چاہئے کیونکہ اس عمل سے اچانک کسی بھی بچے کا ''بول بالا'' ہوسکتا ہے۔

گیس یا تبخیر

کھانا ہضم نہ ہوتو سوء ہضم کی بیماری ہوجاتی ہے۔ ڈکار اور ریح کے ذریعے ہوا خارج ہوتی ہے۔ مریض پیٹ میں درد کی شکایت کرتا ہے۔ عرف عام میں اسے گیس کی بیماری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے ہوا کی بیماری بھی کہتے ہیں اور ظریف شاعر تو ہوا کھانے سے بھی احتراز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

تم ہوا کھانے تو نکلے ہو مگر یاد رہے
بھر گیا پیٹ تو کس طرح سے خالی ہوگا

ظریف لکھنوی

ماہرِ امراضِ معدہ ایک دن کہنے لگا
جس کو دیکھو گیس کے آزار میں ہے مبتلا
ملک میں ہے گیس کی قِلّت کا چرچا ان دنوں
استفادہ کیوں نہیں کرتا کوئی ان سے بھلا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

وعدہ کیا تھا گیس کا میں نے جو آپ سے
واللہ اپنے وعدے سے ہرگز نہیں پھرا
پر جس کو دیکھو اس کو شکائت ہے گیس کی
کس کس کو دوں گا اب میں بھلا گیس کی دوا

سلمان گیلانی

پروین شاکر کے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ آیا ہوگا کہ ان کی ایک عمدہ غزل کا کوئی مزاحیہ شاعر اس قدر حلیہ بھی بگاڑ سکتا ہے۔

کچھ تو ہوا کا درد تھا کھائی تھی کچھ تو دال بھی
بادِ شکم مشامِ جاں کو کر گئی نہال بھی
محفل میں شور تھم گیا یک لخت وہ سہم گیا
جس کو ہوا کا درد تھا کھائی تھی جس نے دال بھی

ڈاکٹر مظہر عباس

ڈاکٹر نے صرف ناظر کو یہ بتلایا مرض
محفلوں کو گرم کرنا ہے سبب تبخیر کا

ناظر ٹونکی

یہ مریض عشق ہے مجھ کو غلط فہمی ہوئی
اس کا میڈیکل کرایا کیس ہے تبخیر کا

خواجہ شائق حسین

نہیں ہے چیز کوئی بھی نکمی اِس زمانے میں
بہت سے لوگ شاعر بھی بنے تبخیر کے باعث

عرفان قادر

خرابیٔ معدہ

بسیار خوری اور کم خوراکی دونوں ہی خرابی صحت کی وجہ بنتی ہیں۔ سیر شکمی اسہال اور فاقہ کشی اضمحلال پیدا کرتی ہے۔ جہاں بسیار خوری خرابئ معدہ کا باعث ہوتی ہے وہیں کبھی کبھی شاعر فاقہ زدہ ہونے کے باوجود مسرور نظر آتا ہے۔

پلیٹوں پر پلیٹیں روٹیوں پر روٹیاں توڑیں
نہ ہو معدے کا کیوں خانہ خراب آہستہ آہستہ

سعدیہ حریم

خالی رہتا ہے توشہ داں اپنا
اس میں روٹی کبھی نہیں ہوتی
فیض جاری ہے جب سے فاقوں کا
پیٹ میں گڑبڑی نہیں ہوتی

چونچال سیالکوٹی

کر گئے وہ ہضم دنیا بھر کو اور اچھے رہے
میں نے فاقہ نوشیاں کیں پھر بھی ہیضہ ہوگیا

بشیر چونچال

پیٹ کا درد

ہر ذی ہوش کو زندگی میں کبھی نہ کبھی پیٹ کے درد کا سامنا کرنا پڑ ہی جاتا ہے۔ پیٹ کے درد کی ہزاروں وجوہات ہیں، جو بہت معمولی امراض سے لے کر شدید نوعیت کے امراض کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے علم نے بخشی ہے ہم کو آگاہی
یہ کائنات ہے کیا اس زمیں پہ سب کیا ہے
مگر بس اپنے ہی بارے میں کچھ نہیں معلوم
مروڑ کل سے جو معدے میں ہے سبب کیا ہے

اطہر شاہ خان جیدی

کھانا کھا کر اٹھا تھا پیٹ میں درد
رنج مجھ کو مگر ذرا نہ ہوا
جھٹ سے پی لی منگا کے "سیون اپ"
"درد منتِ کش دوا نہ ہوا"

ضیاالحق قاسمی

اک روز اپنے پیٹ میں اٹھا شدید درد
اک روز ہم نے پانی پیا تھا اُبال کے

معین اختر نقوی

کیا کرتے ہیں استعمال جو کھانے میں پاپڑ کا
رہا کرتا ہے ان کے پیٹ میں اک شور گڑ بڑ کا

ظریف لکھنوی

ہیضہ یا اسہال

اک بڑے حاجت روا نے مجھ سے پوچھا ایک دن
کس ضرورت کے لئے پیدا کیا انسان کو
زور تھا ان کا ضرورت پہ سو میں نے کہہ دیا
رفع حاجت کے لئے پیدا کیا انسان کو

امیر الاسلام ہاشمی

طب میں یوں تو اسہال کی بیماری کی کئی وجوہات ہیں جن میں جراثیم سرفہرست ہیں مگر دلاور فگار نے اسہال کی بہت سی نئی اقسام بھی دریافت کر لی ہیں۔

خبر ہے شہر میں ہیضہ کا خطرہ بڑھ گیا
یہ جو دریا ہے وبا کا قطرہ قطرہ بڑھ گیا
شہر میں ہیضے تھے پہلے بھی کئی اقسام کے
اور ان میں بعض ہیضے تھے مگر بس نام کے
محفلوں میں شعر پڑھ کر داد دینے کی وبا
یہ بھی ہیضہ ہے مگر کڑوی دواؤں سے دبا
شہر میں ہیضے کے خطرے کا سبب ہیں مکھیاں
شہریوں کے ساتھ کتنی بے ادب ہیں مکھیاں

دلاور فگار

وہ کیا کھائیں گے جن کے دل میں یہ کانٹا کھٹکتا ہے
کہیں ہیضہ نہ ہوجائے کہیں ہیضہ نہ ہوجائے

مجید لاہوری

بھنگیوں کی ہڑتال

گردش دوراں نے ثابت کردیا
رفع حاجت بھی بڑا جنجال ہے
پیٹ پکڑے پھر رہے ہیں شیخ جی
جیسے دھوتی میں بہت سا مال ہے
آگیا روکے سے رُک سکتا نہیں
اپنا اپنا نامۂ اعمال ہے
شہر پر پھینکا گیا ہے گیس بم
جس کو دیکھو ناک پر رومال ہے

سیّد محمد جعفری

اسہال میں جست کی افادیت

جدید تحقیق کے مطابق پانچ سال سے کم عمر بچوں میں اسہال اور سوکھے پن (سوکڑا) کے علاج میں ایک معدنی عنصر جست (zinc) کا ایک بہت اہم کردار سامنے آیا ہے جس کی بنیاد پر اب اس کو بحیثیت دوا شاملِ علاج کیا جارہا ہے۔

سوکھے پن کی دوائی کا ہے خاص جزو
پھول مہکائے یہ جسم کے دشت میں
نکلیں اطفال اسہال کے جال سے
جست پہنچائے منزل پہ اک جست میں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

قبض

آپ کو شائد یہ پڑھ کر حیرت ہو کہ شعرائے ظریف نے نہ صرف قبض کی علامات بلکہ اس کے بچاؤ اور علاج پر بھی سخن آرائی کی ہے

علامات

مفت خفت ہوئی یاروں سے کہ دوڑو میں چلا
نزع سمجھا تھا جسے قبض کی حالت نکلی

اکبر الہ آبادی

گھر کو سر پر اُٹھائیں درد سے ہم
سب کریں ہم پہ تُف خدا نہ کرے
روح ہوجائے قبض چین کے ساتھ
قبض ہوجائے اُف خدا نہ کرے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

علاج

پیٹ میں جب مروڑ اٹھتے ہوں
اس قدر بھی نہ ہول کھایا کرو
غم ہجراں نہیں ہے قبض ہے یہ
رات کو اسپغول کھایا کرو

نسیم سحر

دیا ہے جب سے چورن وید جی نے
اجابت بہ فراغت ہورہی ہے

چونچال سیالکوٹی

دی جو دوائیں قبض کی تو دست لگ گئے
بیمار آج کس کو مسیحا کرے کوئی

حنیف سیماب

خود طبیبوں کو ہے شکائتِ قبض
"کس کی حاجت روا کرے کوئی"

بوگس حیدرآباد عرف خواجہ نصیرالدین احمد

بچاؤ

بولا طبیب اِس پہ عمل ہو اگر سدا
ممکن نہیں ہو قبض میں پھر کوئی مبتلا
نسخہ یہ آزمانا ہے لیکن مَسا و صبح
چوکر کا آٹا، سبزیاں، اور پانی خوب سا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دُبلاپایا موٹاپا

کچھ لوگ زندہ رہنے کے لئے کھاتے ہیں اور کچھ کھانے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ موخرالذکر اقسام کے ہی وہ لوگ ہیں جو ڈاکٹر صاحبان کو بار بار فیس دے کر ان کے دل وجگر کے لئے

باعثِ تقویت ہوتے ہیں۔ لحیم شحیم جسم ہوں یا پتلے اور سوکھے جسم دونوں ہی صحت سے دور اور بیماری سے دوچار رہتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر مٹاپا اتنا کثرت سے نہیں پایا جاتا جتنا موٹوں کی جسامت کے سبب پھیلا نظر آتا ہے کہ فربہ حضرات کی تصویر کو دونوں آنکھیں بھی سمیٹنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ فربہی کے موضوع پہ ظریف شعراء نے کچھ اس قدر لکھا ہے کہ اس موضوع پہ ایک الگ سے پورا مضمون ارمغان ابتسام کے صفحات کی زینت بن چکا ہے لہٰذا یہاں دبلاپن کے موضوع پہ ایک اکلوتی نظم پیش کی جارہی ہے۔ مسٹر دہلوی نے مٹاپے پر نظم لکھی تو دبلے حضرات کا بھی انہیں خیال آگیا۔ لہٰذا انہوں نے ان کیلئے بھی ایک ایک عدد نظم کہہ ڈالی۔

دُبلاپا

کی نظم مٹاپے کی جو مسٹر نے حکایت
موٹے جو تھے احباب انہیں ہے یہ شکایت
دبلوں سے بھلا کس لئے برتی ہے رعایت
فطرت سے ہے بچھو کے بعید ایسی عنایت

یہ لیجئے دبلوں کا بھی حاضر ہے قصیدہ
سن لیجئے ہمارے بھی اب اوصاف حمیدہ

صورت سے نظر آتے ہیں سوکھا ہوا میوہ
اک ٹھیس بھی لگ جائے تو برسوں کی ہے سیوا
آندھی میں کہیں نکلے تو بیوی ہوئی بیوہ
اس پر بھی یہ دبلوں کا ہمیشہ سے ہے شیوہ

غصہ ہے دھرا ناک پہ لڑتے ہیں ہوا سے
بندوں سے نہ وہ خوش ہیں نہ راضی ہیں خدا سے

جاں ان کی لئے لیتی ہے معدے کی خرابی
ہٹنے نہ دیں وہ سامنے سے پھر بھی رکابی
کھاتے ہیں کہ پرخوری ہے ان کے لئے بابی
معدے میں سدا بھرتے ہی رہتے ہیں وہ چابی

بکری کی طرح خوب دبا کر ہیں وہ کھاتے
لکڑی کی طرح ہیں وہ مگر سوکھتے جاتے

ناخوش ہیں وہ جینے سے انہیں دہر سے نفرت
دنیا کو جلائیں انہیں رہتی ہے یہ حسرت
مرتے ہیں تو بدلے کی یہ کر جاتے ہیں صورت
جاتے ہیں یہاں چھوڑ کے اولاد بکثرت
انسان کی امپورٹ کا گر جائزہ لیجے
دبلوں کو ملیں فرسٹ ڈویژن میں نتیجے

مسٹر دہلوی

ہچکی

ہچکیوں کی یوں تو بہت سی وجوہات ہیں مگر ہمارے یہاں عام طور پر اس کو کسی کے یاد کرنے سے منسلک کر دیا گیا ہے

معدے اور جگر کے متعدد امراض ہچکیوں کا سبب بن سکتے ہیں زیرِ نظر نظم میں خالص طبی اسباب بیان کئے گئے ہیں جو ایک ڈاکٹر شاعر کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

جسم پہ چھا رہا تھا اِضمحلال
اور معلوم تھی نہ وجہ ملال
ہچکی آئی تو دل یہ شاد ہوا
ختم یوں جان کا فساد ہوا
ہم یہ سمجھے کرے ہے یاد حبیب
یعنی کھلنے کو ہیں ہمارے نصیب
یہ جنوں عشق کا فزوں ہوگا
کیا خبر تھی ہمیں کہ یوں ہوگا
ہچکیاں آئیں گی تسلسل سے
گُل پریشان ہو گا بُلبُل سے
ہوں گے حاضر درِ طبیب پہ ہم
غم بڑھیں گے نہ ہوں گے ہرگز کم
جب ہوا اپنا حال اور خراب
پہنچے ہم ڈاکٹر کے پاس شتاب
ہچکیاں سُن کے نبض دیکھ کے وہ
بولے ”افوہ غضب ارے اوہ ہو“
یہ تو تبخیر کی علامت ہے
یہ کہاں مختصر علالت ہے
اس میں کوئی نہیں ہے عیاری
خود ہی سنئے صدائے بیماری
گیس بن بن کے ہوگی اب خارج
کہہ رہی ہے یہی مری نالج
ٹیسٹ کرنے پڑیں گے عالی جناب
ہچکیوں کے ہیں اور بھی اسباب
اس میں ہرگز نہیں ہے کچھ ابہام
ہچکیوں کا سبب ہے ”ڈایا۔فرام“
مشتعل اس کی نس اگر ہوجائے
ہچکیوں میں ہی آدمی کھو جائے
فعل گردوں کا ہو خراب اگر
ہچکیاں تب بھی آتی ہیں اکثر
ہو اگر عارضہ کوئی قلبی
ہچکی آتی ہے اُس مریض کو بھی
اس کی کچھ آپ کو خبر بھی ہے
اِک سبب سوزشِ جگر بھی ہے

جگر

تشخیص کوئی کر نہ سکا میرے مرض کی
شائد ہے مرا درد جگر اور طرح کا

اسد جعفری

اُردو شاعری دل اور جگر کے تذکرے کے بغیر نامکمل نظر آتی ہے۔ دل کے بغیر عاشق کی عاشقی ادھوری ہے تو محبوب کو حاصل کرنے کے لئے عاشق کے پاس اگر مضبوط جگر نہ ہو تو بھی عشق کی منزل تک رسائی ممکن نہیں۔ کیونکہ عاشق صادق کو بلند ہمت کا حامل ہونا چاہئے کہ اردو شاعری میں جگر، جرات و ہمت کی علامت ہے۔ جس طرح جگر کے بغیر زندگی ممکن نہیں اسی طرح لختِ جگر کے بغیر بھی زندگی اپنی معنویت کھو دیتی ہے:

وسوسے اُٹھتے ہیں دل میں اِس قدر
ہول آتا ہے مجھے یہ سوچ کر
ہُوں جگر کے عارضے میں مبتلا
کیسے بیٹے کو کہوں لختِ جگر؟

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جب جگر کر رہا ہو آہ و فغاں
ہچکیوں سے نہ کوئی پائے اماں
ہو مرض میں جو مبتلا پتہ
یوں ہی پڑتی ہے جان پر پتّا
یہ نہ سمجھو کہ کوئی کرتا ہے یاد
پیٹ کے کیڑے بھی کریں یہ فساد
سُن کے ''تفصیلِ علّتِ ہچکی''
بندھ گئی اپنی اور بھی ہچکی
دِل میں پیدا ہوئے کئی وسواس
کاش جاتے نہ ڈاکٹر کے پاس
ہچکیاں لیتے رہتے صبح و شام
سوچتے یار بھیجتا ہے سلام
ڈوبے رہتے خیال میں اُس کے
ہچکیاں لیتے اور سر دُھنتے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

امراضِ جگر

پہلے میڈیکل اسپیشلسٹ ہی امراض جگر کو بھی دیکھتا تھا مگر تخصیص کے اس دور میں مزید تخصیص کرتے ہوئے اب ''ہیپاٹالوجسٹ''ان امراض کو دیکھتا ہے۔ہمارے یہاں گھر گھر جگر کی گرمی کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔پھر انگریزی دواؤں کی گرمی کے قصے بھی کم مشہور نہیں۔

سوزشِ جگر

اردو ادب میں سوز جگر اور امراض جگر میں سوزش جگر بہت عام ہیں۔

دبانا دبانا مری پنڈلیوں کو
کہ ان میں ہے سوز جگر مام دینا

امام دین گجراتی

ہیپاٹائیٹس یا سوزشِ جگر بے شمار جراثیم، ادویات، موروثی بیماریوں اور الکوحل وغیرہ سے ہوسکتا ہے۔لیکن ہیپاٹائیٹس کے وائرس اس سلسلے میں کافی بدنام ہیں اور اب تک کچھ وائرس مثلاً اے، بی، سی، ڈی، ای، جی دریافت ہو چکے ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ مزید تحقیق سے نئے جراثیم کا پتہ لگے۔

ڈانٹ کر بولے یہ امراضِ جگر کے ماہر
بات ہنسنے کی نہیں بند کرو بتیسی
ہیں جگر میں ہی نہاں سارے حروفِ ابجد
وائرس سارے ہیں موجود یہاں ''اے، بی، سی''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہا معائنہ کرکے حکیم حاذق نے
یہ ٹیسٹ خوف و خطر کے سوا کچھ اور نہیں
کسی کو ''اے'' ہے، کسی کو ہے ''بی''، کسی کو ''سی''
''حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہتا تھا یہ مریض کہ کچھ فائدہ نہیں
کب سے دکھا رہا ہوں ہر اک ڈاکٹر کو میں
''اینجائنا'' بھی ہے مجھے ، یرقان بھی مجھے
''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

یرقان

آنکھوں کی سفیدی جب پیلے پن کا شکار ہوجائے تو عرف عام میں اسے پیلیا یا یرقان کہا جاتا ہے۔یرقان بہت سی بیماریوں

کی علامت ہے بذات خود بیماری نہیں بلکہ بہت سی بیماریوں کا پیش خیمہ ہے۔پتہ جگر اور خون کی بہت سی بیماریاں باعث یرقان ہوسکتی ہیں۔میڈیکل وجوہات میں جہاں سوزش جگر اس کی ایک عام وجہ ہے وہیں سرجیکل وجوہات میں پتے کی پتھری بھی یرقان کی ایک عام وجہ ہے

ہجر میں پتہ مارا پتھری ٹوٹ گئی
کب ہوگا یرقان خدا ہی جانتا ہے

اطہر شاہ خان جیدی

مژدہ ہو آج تم کو مریضانِ آرزو
لاحق مجھے بھی ہوگیا یرقانِ آرزو

عاشق محمد غوری

کیوں ہنس رہے ہیں دیکھ کے حلیہ مریض کا
یرقان ہے یہ کشت نہیں زعفران کی

بشیر چونچال

جب سے پڑی ہے جسم میں یرقان کی طرح
اسمارٹ ہوں میں آج کے انسان کی طرح

نوید ظفر کیانی

یہ مرے دارالحکومت کا ہے خاور امتیاز
اس کے پانی سے مجھے یرقان ہونا چاہئے

خاور نقوی

ہوں اگر خالص وفا کے کیپسولز
دیدہ و دل کا نہ پھر نقصان ہو
ہجر کی خوش ذائقہ ہوں گولیاں
وصل کے سیرپ سے کیوں یرقان ہو

مجذوب چشتی

تم تو جھڑوانے گئے تھے پیلیا انگلینڈ میں
ہر دوا کے طور پہ کچھ پی لیا انگلینڈ میں
وہ فسادِ خوں ہو یا خطرہ فسادِ خلق کا
ہر مرض کی آج چلتی ہے دوا انگلینڈ میں

عنایت علی خان

کہاں تک سوچئے اس مسئلے پر
دماغی پیچ ڈھیلے ہوگئے ہیں
ہمیں تو پیلیا ہی بس ہوا تھا
کسی کے ہاتھ پیلے ہوگئے ہیں

اقبال فردی

ادھر لوگ یرقان کی ہیبت سے پریشان اور اس کے علاج میں کوشاں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف شاعر ظریف یرقان میں بھی اپنا فائدہ ڈھونڈ نکالتا ہے ؎

رس گنے کا پینے کو ملا خوب ہمیں بھی
یہ فائدہ دیکھا ہے تو یرقان میں دیکھا

ضیاالحق قاسمی

جگر کے بہت سے افعال میں سے ایک اہم کام کولیسٹرول بنانا بھی ہے لہذا امراض قلب وجگر کے مریضوں کو اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے ان سے دوری میں اختیار کرنی پڑتی ہے، جگر کے ساتھ مزاحیہ شعرا کی چھیڑ خانی ملاحظہ کیجئے

۵۵ برس کے بعد بھی پتلی سی ہے کمر
اور تنگ اس کوئی لبادہ نہیں ہوا
حیرت ہے عاشقوں کے کلیجے چبا کے بھی
اس کا کولیسٹرول زیادہ نہیں ہوا

سرفراز شاہد

میں نے کہا کہ جل کے جگر ہوگیا کباب
گردن اٹھا اٹھا کے وہ کچھ سونگھنے لگے

نامعلوم

جگر میں درد ہو دل میں کہ دانت میں یارو
مزہ نہ آئے کبھی تھوڑی ہائے ہائے بغیر

نسیم سحر

تشخیص

امراضِ جگر کی تشخیص میں جہاں اور بہت سے خون کے ٹیسٹ ہوتے ہیں وہیں ایک خاص ٹیسٹ کو بائیوپسی کہا جاتا ہے جس میں ''بائیوپسی نیڈل'' کے ذریعے جگر میں سوئی ڈال کر اس کا ایک ٹکڑا تشخیص کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔

سب سمجھ جائے گا اب ماہرِ امراضِ جگر
دستِ تشخیص میں اک چیز نیاری آئی
لے کے ''بائیوپسی نیڈل'' وہ یہ فرماتا ہے
''اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی''

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کہنے لگی یہ بیوی اے میرے ڈاکٹر جی
جو آپ کر رہے ہیں دن رات اے، بی، سی، ڈی
اِس کے طفیل انگلش آسان ہو گئی ہے
جو سوزشِ جگر سے لختِ جگر نے سیکھی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔اِن کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ وشگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

حصارِ عشق میں جب قافیہ پیمائی ہوتی ہے
خبر مُنّے کی پیدائش کی گھر میں آئی ہوتی ہے

ہوئے ہیں جب سے ہم پیدا یہی ہم نے سنا اکثر
بجٹ جیسا بھی آئے کچھ نہ کچھ مہنگائی ہوتی ہے

ترقی کر گئے کھا کھا کے اب ہم بھی جسامت میں
کبھی لمبائی ہوتی تھی پر اب گولائی ہوتی ہے

نہ بیگم سے کبھی ٹکرا کہ ہو جائے گا خود ٹکڑے
یہ ایسی جنگ ہے جس میں سدا پسپائی ہوتی ہے

ہے اُن کی آمدن بالا تو طرزِ زندگی اعلیٰ
یہاں تو دودھ میں بھی اب نہیں بالائی ہوتی ہے

سمجھ آتا نہیں کیونکر میاں بیوی کے جھگڑے میں
تنازع کی وجہ اکثر حسیں ہمسائی ہوتی ہے

پھسل جاتے ہیں اس پر سے بڑے نامی گرامی بھی
خوشامد میں عزیزم اس قدر چکنائی ہوتی ہے

گھروندے جیل کی مانند ہی لگتے ہیں شہروں میں
نہ ان میں صحن ہوتے ہیں نہ اب انگنائی ہوتی ہے

رہِ طنز و ظرافت ہے بہت پُر پیچ سی مظہرؔ
یہ وہ رستہ جس کے دونوں جانب کھائی ہوتی ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

حکومت بل تھمانے کے لئے ہے
تو پبلک بلبلانے کے لئے ہے

کوئی شاعر کمانے کے لئے ہے
کوئی مصرعہ اُٹھانے کے لئے ہے

کھلا یہ راز بعد از عقد اُن پر
کہ بیوی صرف طعنے کے لئے ہے

نہ کھا تو پان سبزی کی طرح اب
ارے یہ تو چبانے کے لئے ہے

کہا بیگم نے تل اشعار اپنے
نہیں کچھ بھی پکانے کے لئے ہے

ترے گھر کا ہے جو پُر پیچ رستہ
مرے جُوتے گھِسانے کے لئے ہے

ابھی تو ہم غبارے بھر رہے ہیں
سنا تھا نل نہانے کے لئے ہے

کبھی آوارہ گردی تھی مگر اب
موبائیل دوستانے کے لئے ہے

جو رش میں فُٹ جگہ مل جائے تجھ کو
سمجھ گاڑی گھُسانے کے لئے ہے

رہیں قائد سدا شاد اور آباد
یہ ملت بس ترانے کے لئے ہے

تنویر پھولؔ

عاشقی کا بھوت اُترا اُس سے ٹکرانے کے بعد
سر پہ گومڑ پڑ گئے ہیں جوتیاں کھانے کے بعد

خوب اُچھلتا تھا مگر اب دل میں ہے پچھتا رہا
ڈارون کا بوزنہ انسان بن جانے کے بعد

اپنے لیڈر ہیں قصائی اور پبلک بَیل ہے
بَیل تو خاموش ہو جاتا ہے ڈکرانے کے بعد

کیا بنتی سی سیاست ہے وطن میں دوستو!
گر گئیں ساری پتنگیں خوب لہرانے کے بعد

دشت اور دریا کا قصہ ہے عبث اقبال کا
سُست ہو کر ہم پڑے ہیں گھوڑے دوڑانے کے بعد

راجہ اِندر بن کے بیٹھے تھے پرستاں میں اُداس
پیر جی کا مکھڑا چمکا اُن کے نذرانے کے بعد

کچھ عجب سی ہے مہک پھیلی درونِ کینٹین
خوب لیتے ہیں ڈکاریں یار لنچانے کے بعد

کاٹنے دوڑا تھا لیکن اب تو اس کا ہے یہ حال
دُم ہلاتا ہے ترا سگ بوٹیاں کھانے کے بعد

اُس کی اماں چاٹتی ہیں اور لیتی ہیں ڈکار
بن گیا پودینہ چٹنی، سل پہ پس جانے کے بعد

پھولؔ جی اہلِ قلم ہیں، گُل کھلاتے روز ہیں
جیسے غنچے پھول بن جاتے ہیں مسکانے کے بعد

تنویر پھولؔ

پبلک کا ہر مہینے کچومر بنایئے
بل اس کا بھاری کیجئے، بجلی گرایئے

ڈالر کی بادشاہی میں رُپیہ حقیر ہے
اب اس کی حکمرانی سے پیچھا چھڑایئے

دو بیویاں ہی آئی ہیں، باقی ابھی ہیں دو
سب شوہروں کو اپنی لیاقت دکھایئے

پچھواڑا صاف کیجیے، جتنے بھی صدر ہیں
بدہضمی کا علاج کسی سے کرایئے

سب کہہ رہے ہیں، گوشت میں مرغی کے زہر ہے!
تحقیق اس کی کیجئے، پردہ اُٹھایئے

سونے کے انڈے کھا گئے، پبلک تھی محوِ خواب
سب ڈاکوؤں کو جلد ہی مرغا بنایئے

روٹی جو مانگتے ہیں، اُنھیں کیک دیجئے
یونان جا کے نان کی قیمت بڑھایئے

آنکھیں تو دیکھتی ہیں مگر ہم خموش ہیں
سر پھٹ رہا ہے درد سے، گولی کھلایئے

کھانی ہو نان، جایئے یونان دوستو!
پھر پان کھانے کے لئے جاپان جایئے

بارش ہوئی ہے باغ میں ہر سُو ہیں بلبلے
اے پھولؔ! بلبلوں کو یہ نغمہ سنایئے

ڈاکٹر عزیز فیصل

جلد ہی نثر نگاروں کی پٹائی ہو گی
یہ ہوائی کسی شاعر نے اڑائی ہو گی

ابھی غزلوں کی جراحت میں وہ الجھی ہوئی ہے
اس میں بالواسطہ نظموں کی بھلائی ہو گی

چوڑیاں کیسے میں سونے کی اسے پہناؤں
گیس پائپ کے برابر جو کلائی ہو گی

رخ جاناں پہ مرڈے کے نشانوں سے کھلا
وہ پرستان کے دیہات سے آئی ہو گی

ایک بالشت سے اوپر ہے اگر ہجر کا زخم
کم سے کم اب کسی موچی سے سلائی ہو گی

درس و تدریس کے جتنے بھی مراکز ہیں یہاں
آخر اک روز تو ان میں بھی پڑھائی ہوگی

اپنے سرتاج کو پھر نیند میں تھپڑ مارا
اس کو عامل نے یہ تدبیر سکھائی ہو گی

پان خورے کو یہ ڈینٹسٹ نے بتلایا ہے
ڈایہ لیزر سے ترے منہ کی صفائی ہو گی

پانچویں جانِ تمنا سے بھی گپ شپ کی عزیزؔ
مرے اس دل کی تہہ دل سے ترائی ہو گی

ڈاکٹر عزیز فیصل

حسن کی کمپنی نہیں ملتی
یہ سہولت فری نہیں ملتی

"فورجی"، سگنلوں کے دور میں بھی
اک بھی اُس لب پہ "جی" نہیں ملتی

ہجر تو بوریوں میں بکتا ہے
وصل کی اک پُڑی نہیں ملتی

وہ ہے قحط النسا کہ قاف میں بھی
دیو تو ہیں، پری نہیں ملتی

وہی شعرِ جدید ہے جس میں
اونس بھر شاعری نہیں ملتی

گائکہ کے گلے پہ لکھا ہے
اس جگہ گائکی نہیں ملتی

نویؔد صدیقی

شاعری کے حسن میں یوں پیدا اثر اس نے کیا
زیر تھا جس لفظ میں اُس میں زبر اس نے کیا

گھر سے جو فارغ تھا اور نالاں تھا گرمی کے سبب
میٹرو بس میں زیادہ تر سفر اس نے کیا

ممتحن نے ہاتھ سے ناپے بنا نمبر دیے
اک بڑے سے دائرے میں اک صفر اس نے کیا

تب کہیں جا کر ہوئی سچی محبت کام یاب
باپ کو راضی ادھر میں نے ادھر اس نے کیا

مشتمل تھا ساٹھ شعروں پر کلام اس کا نویؔد
کھا کے کچھ انڈے، ٹماٹر مختصر اس نے کیا

نویؔد صدیقی

گر لگائے رخِ تاریک پہ ''تبت'' کم کم
دیکھ کر ہو اسے عشاق کو وحشت کم کم

ہر گھڑی اس کو رکھا جائے کہیں پر مصروف
سر کھجانے کی میاں کو ملے فرصت کم کم

چار شادی کی اجازت کے سوا دیکھا ہے
شیخ صاحب کو نظر آتی ہے سنت کم کم

سیٹ ملتی نہیں جس شخص کو پیداواری
بس وہی شخص یہاں لیتا ہے رشوت کم کم

حاکمِ وقت کو اے کاش! کوئی بتلائے
اس نے دولت تو کمائی بہت، عزت کم کم

''ہائے'' لکھ کر جو یہاں داد عطا کرتے ہیں
مضحکہ اس میں زیادہ ہے، اِرادت کم کم

آدمی ڈھیٹ ہو جو شرم سے بھی عاری ہو
اس کو محسوس ہوا کرتی ہے ذلت کم کم

آنکھ اب ظاہری شو، شا پہ فدا ہوتی ہے
دل میں جا کرتی ہے کردار کی زینت کم کم

سب کی سنتے ہیں مگر ان سنی کر دیتے ہیں
یوں نویؔد آتی ہے تکرار کی نوبت کم کم

عرفاؔن قادر

آخر کب تک دنیا بھر سے بات رہے پوشیدہ
بیلن مار کے بیگم نے پھوڑا شوہر کا دیدہ

شاید بن ہی جاؤں میں، اِس بار وزیرِ اعظم
کوشش تو سر توڑ کیے جاتے ہیں شیدا مِیدا

ہر اک زہر کا ہے تریاق میسر گرچہ، یارو!
لیکن بچ پائے وہ کیسے، ہو جو ساس گزیدہ

غزلیں سُننے سے انکار کیا تھا برسوں پہلے
آج تلک ہیں اُس ہمسائے سے حالات کشیدہ

اور ذہین ہے کون بھلا دنیا میں اُس بندے سے
شام و سحر جو بیوی کا ہی پڑھتا رہے قصیدہ

چار کنال کی کوٹھی تھی، پینسٹھ سو سی سی گاڑی
ایسے تو لیلیٰ کا اتنا قیس نہ تھا گرویدہ

مطلب تو معلوم نہیں ہے، رعب پڑا لوگوں پر
استعمال قوافی میں کر ڈالا ہے ژولیدہ

پہلے شہر میں عزّت تھی، اب جاتا ہوں جس کوچے
ہر کوئی آواز لگائے، چل او زنّ مُریدا

سب اچھے اخبار کلام ہمارا جب ناں چھاپیں
آؤ جاری کر دیتے ہیں اپنا ایک جریدہ

شاید ایک چھٹانک برابر وزن گھٹے ورزش سے
برگر شرگر کھا کر، موٹے! کوشش کر سنجیدہ

خوبی ایک بیان کریں، الفاظ نرالے کتنے
لوبھی، شوم، گریڈی ڈاگ، بخیل، حریص، ندیدہ

کیونکر اپنی جان مصیبت میں ہے ڈالی، رانجھے!
کنگھی کرنا بھینس کی دُم، ہے کام بہت پیچیدہ

لُوٹ کھسوٹ کریں بے خوفی سے ڈٹ کر جو لیڈر
مر کر زندہ ہونا اُن کا شاید نہیں عقیدہ

تیری باتیں کون سُنے گا، مت ڈسٹرب اِسے کر
چُپ کر جا عرفاؔن! ہے چونکہ قوم ابھی خوابیدہ

عرفاؔن قادر

اے راہنماؤ! تھوڑا سا اس بات کا تو احساس کرو
اُلٹی سیدھی پالیسی سے، مت دیس کا ستیاناس کرو

ٹکرا کے اُلٹ جائیں نہ ٹرالر اور ٹرک بجری سے بھرے
موٹوں سے کہو، دائیں بائیں سے دیکھ کے روڈ کراس کرو

آزادی ہی آزادی ہے، اظہار کی سب کو آزادی
آ جاؤ شام کو ٹی وی پر، اور بیٹھ کے جو بکواس کرو

انجام ہے انڈین فلموں کا، مانے یا کوئی نا مانے
اک بچہ بولا جیون میں جو کچھ بھی کرو ”ہن داس“ کرو

ہے بیاہ تمھارا ہو بھی گیا، موسم آیا ہے الیکشن کا
اب دھرنے ورنے چھوڑ بھی دو، جا کر جلسے اجلاس کرو

جب چار عدد زوجائیں ہوں، اطفال ہر ایک سے درجن بھر
پھر اُس کے بعد کی فکر ہے کیا، چاہے انچاس پچاس کرو

جا جا پیپسی کے سٹال لگے، ملتے ہی نہیں پانی کے گھڑے
لائے گا کہاں سے بیس رُپے، اب کیسے بجھائے پیاس ”کرو“

ہے باری کِس کی برتن ورتن کپڑے وپڑے دھونے کی
تم شعلے فلم کا سِکّہ لے کر روز اُسی سے ٹاس کرو

اشعار کہو چاہے طرحی، عرفاؔن بنو مت ”فیس ٹکی“
دیوان پرنٹ کرا بھی لو، غزلیں زیبِ قرطاس کرو

اسانغنی مشتاق رفیقی

کاش رب نے مجھے شوہر نہ بنایا ہوتا
اُس کی جنت سے مرا یوں نہ نکالا ہوتا

آپ کی گود میں رہتا یا کبھی بانہوں میں
کیا مزے ہوتے جو میں آپ کا کُتا ہوتا

کاش میں جہیز کے لالچ میں نہ پڑتا جاناں
تُو دلہن ہوتی مری میں ترا دولہا ہوتا

اُن کے ہاتھوں سے نئی سڑکیں یہاں بچھواتا
میں اگر شہر کے مجنوؤں کی لیلیٰ ہوتا

صدر بن جاتا اگر میں بھی کسی پارٹی کا
وودیشی بینکوں میں پھر میرا بھی کھاتا ہوتا

ہر کوئی سُنتا مری گاڑی میں ریڈ لائٹ ہوتے
کسی منتری کا اگر میں بھی بھتیجا ہوتا

اپنے ایمان کو میں بیچ دیا ہوتا اگر
یوں بُری طرح الیکشن میں نہ ہارا ہوتا

کتنی معصومی سے ظالم نے کہا میٹنگ میں
میں اگر گھر نہ جلاتا تو اندھیرا ہوتا

اب کے دعوت میں ولیمے کی بُلا لیتے اگر
میں بھی اوروں کی طرح آپ کا شیدا ہوتا

لڑکیاں سیکھیں گی اسکول میں اب یوگا بھی
اک پریڈ ڈانس کا بھی ہوتا تو اچھا ہوتا

اے رفیقؔ میں زباں بند اگر رکھ لیتا
ہر گھوٹالے میں یقیناً مرا حصہ ہوتا

اسانغنی مشتاق رفیقی

گل و بُلبل کے نغمے گُنگنا لیتے تو اچھا تھا
ترے مُکھڑے سے ہم غزلیں چُرا لیتے تو اچھا تھا

بہت رُسوا ہوئے سچائیوں کی راہ پر چل کر
کسی نقال کو ہیرو بنا لیتے تو اچھا تھا

نہ کُرسی چاہیے مجھ کو نہ میں زلفوں کا دیوانہ
مجھے بھی بزم میں اپنے بُلا لیتے تو اچھا تھا

یہ زاہد ہیں، بڑے معصوم ہیں، جنّت میں جائینگے
بنا کر ہم اِنہیں مُرشِد دعا لیتے تو اچھا تھا

زنانے میری بستی کے بہت پردوں کے رسیا ہیں
انہیں پردوں سے اِک پرچم بنا لیتے تو اچھا تھا

اُنہیں تینتیس فیصد ملنے والا ہے ریزرویشن
نئی اک پارٹی وہ بھی بنا لیتے تو اچھا تھا

بہت غصے میں ہیں بیگم ہماری رنگ رلیوں سے
ہم اپنی فیس بُک اُن سے چُھپا لیتے تو اچھا تھا

کم از کم کونسلر بن کر تری چوکھٹ تو چوم آتے
الیکشن میں بھی قسمت آزما لیتے تو اچھا تھا

تِلک ماتھے پہ لگوا کر جتانے خود کو جمہوری
کسی سوامی کے آگے سر جُھکا لیتے تو اچھا تھا

لہو کے رشتے بھی بے رنگ ہو جاتے ہیں غُربت میں
بھلے کا لا سہی کُچھ دھن بنا لیتے تو اچھا تھا

ہمیشہ طنز کی باتیں نہیں اچھی رفیقؔ جی!
کبھی نشتر کو گُل کہہ کر ہنسا لیتے تو اچھا تھا

نوید ظفر کیانی

صبر کا تڑکا لگا کر سوکھی پھوکی گھاس کو
دیں گرانی میں گدھوں کو (ہم عوام الناس کو)

بیف کے ہوں یا مٹن کے نرخ، پکڑائی نہ دیں
سچ کہیں تو دیکھتے ہیں عید پر ہی ماس کو

لاد کر کچھ اور قرضے ہم گدھوں پر چل دیے
خاک پورا کرتے لیڈر ارتقاء کی آس کو

ہو چکا کب کا اڑن چھو ہم سے اسپِ ارتقاء
اور ہم تھامے کھڑے ہیں اب بھی اُس کی راس کو

ٹھینگا دکھلاتا ہے لیکن حُسن بتلاتا نہیں
کیا کریں دل والے آخر عشق کے خناس کو

اُس کی لیلیٰ تو ''ڈیفنس سوسائٹی'' میں جا بسی
حضرتِ مجنوں چلے کس کے لئے بن باس کو

لازمی ہے دُم ہلانے کے لئے سسرال میں
پوری تیاری سے جائیں کوچۂ حساس کو

اختلافِ رائے کے کچھ اور بھی پیرائے ہیں
نامناسب ہے دولتی جھاڑنا یوں داس کو

شربتِ دیدار ہے درکار مجھ کو مئے نہیں
دنیا والوں نے غلط سمجھا ہے میری پیاس کو

تاڑتے ہیں کس لئے نوخیز کلیوں کو ظفرؔ
عمر دیکھیں، جا لگے ہیں آپ ہم انچاس کو

نوید ظفر کیانی

خوابِ سلمٰی و ریحانہ بھی ضروری ٹھہرا
نوجوانی میں یہ طعنہ بھی ضروری ٹھہرا

کچھ مسائل اِسی ترکیب سے حل ہوتے ہیں
خود کو دیوانہ بنانا بھی ضروری ٹھہرا

آج کل ڈیموکریسی کا وطیرہ ہے یہی
ہر حکومت کو گرانا بھی ضروری ٹھہرا

عقل کی بات جسے ہضم نہیں ہو سکتی
اُس کی گچی پہ ٹکانا بھی ضروری ٹھہرا

کسی لیڈر سے ڈکارا نہیں جاتا منصب
''ہاجمولا'' کا کھلانا بھی ضروری ٹھہرا

نیوز چینل پہ مچھندر یوں چلے آتے ہیں
جیسے بچوں کو ڈرانا بھی ضروری ٹھہرا

زن مریدی کی بھی پھبتی اُسے لگتی ہے بُری
اور گھر ہاتھ بٹانا بھی ضروری ٹھہرا

اپنے بارے میں جنہیں خاصی غلط فہمی ہے
آئینہ اُن کو دکھانا بھی ضروری ٹھہرا

گھر میں برتن یونہی ٹکراتے رہیں گے کب تک
یہاں اک فرد سیانا بھی ضروری ٹھہرا

روز بیگم کو سخن گوئی کا (سوتن کا) گلہ
روز یہ قومی ترانہ بھی ضروری ٹھہرا

روبینہ شاہین بیناؔ

تم نے گھر میں جو سکونت کی ہے
کتنے کاموں میں سہولت کی ہے

شہری بابو سے محبت کر کے
ہیر نے گاؤں سے ہجرت کی ہے

خوب پھبتی ہے لگی عشق کو
پہلی بیوی سے بغاوت کی ہے

غائب ہر روز کوئی چیز ہوئی
گھر میں ماسی نے سکونت کی ہے

عقدِ نو اس نے کیا ہے چوتھا
خود پہ جائز جو شریعت کی ہے

دل بھلا اُس کا طرفدار ہے کیوں؟
جس نے جذبوں کی تجارت کی ہے

بینک بیلنس جو بڑھایا بیناؔ
میری ہر ایک نے عزت کی ہے

روبینہ شاہین بیناؔ

برفیاں بھی زخمی ہیں، گلگلے بھی زخمی ہیں
توند کی لڑائی میں کوفتے بھی زخمی ہیں

اِک سیاسی جلسے میں بٹ رہی ہے بریانی
ایسی دھینگا مشتی ہے پلپیئے بھی زخمی ہیں

نو بیاہتا دلہن کے ہاتھ کا جو کھایا ہے
توند سر پٹختی ہے، ہاضمے بھی زخمی ہیں

جس سے چیٹ کر بیٹھو نامُراد عاشق ہے
فیس بک پہ جانے کیوں فیکیئے بھی زخمی ہیں

بن سنور کے نکلا ہے گھر سے برگری بچہ
جینز بھی پرانی ہے، پائنچے بھی زخمی ہیں

قید کر کے رکھا جو میں نے چند مرغوں کو
مرغیاں بھی زخمی ہیں ٹوکرے بھی زخمی ہیں

خوب ہیڈ رائٹنگ ہے آنسہ بشیراں کی
کاپیاں بھی زخمی ہیں، حاشیے بھی زخمی ہیں

عاشقوں کی خاطر بھی خوب ہو گئی بیناؔ
چھوکری کے سینڈل سے چھوکرے بھی زخمی ہیں

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

زن گزیدوں میں کہ جو شیخی بگھارا تھا کوئی
چار تھیں یا بیویاں یا تو کنوارا تھا کوئی

لد کے گھر لوٹا تو پھر دوڑا دیا بازار کو
اس قدر شوہر میاں تابع بچارا تھا کوئی

مشتعل ہونے سے بہتر ہے کہ چُپکا ہو رہے
گرچہ بیگم نے تو لتر خوب مارا تھا کوئی

مونچھ سے ٹپکے لہو لیکن گھرستن چاق تر
رو پڑا اِتنا کہ شائد "آب پارا" تھا کوئی

پھر رگِ شیطان پھڑکی، ہو گئے ٹھٹھے شروع
ابتسامی یار جیسے اِک شمارا تھا کوئی

گوہری افکار کھل کر رکھ دیے ہیں سامنے
کیا ہی کہنے ایک ہی لیکن پکارا تھا کوئی

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

جب بات کر رہا تھا اتنی چبا چبا کر
جیسے نگل گیا ہو گولی چبا چبا کر

اِک منحنی سا شوہر اس پر دبنگ بیگم
شائد کہ کھا چکا ہو بیوی چبا چبا کر

متلا گیا مرا دل کھاتے ہوئے جو دیکھا
منہ کھول کھا رہا تھا بوٹی چبا چبا کر

بھوکا سُنے بھی کیسے پرہیز کیا بلا ہے
کہہ دے طبیب کھاؤ روٹی چبا چبا کر

کھانے کو مل نہ جائے دو من ہو جس کی ووٹی
کھائے، لذیذ ہو گی موٹی چبا چبا کر

کر کے جو آدھ موا بد مست ہو کے چل دی
خرانٹ نے گہر کی ہڈی چبا چبا کر

اقبال شانہ

مجھے وہ ایلین سی لگ رہی ہے
فلک سے جانے کیسے گر پڑی ہے

اسے معلوم مجھ میں کیا کمی ہے
نجومی کی وہ بیٹی لگ رہی ہے

خیالِ خام گر یہ آپ کا ہے
تو لو حاضر ہماری شاعری ہے

مجھے کچا چبا کر کھائے گی کیا
وہ مجھ کو گھورتے ہی جا رہی ہے

مجھے بھوتوں سے ڈر لگتا نہیں ہے
میری قسمت میں شاید بھوتنی ہے

سبھی کہتے ہیں یہ میری غزل پے
ہماری شاعری کیا دل لگی ہے

ہمیشہ سوچتی رہتی ہے شانہ
وہ افلاطون جیسی لگ رہی ہے

اقبال شانہ

میک اپ میں ترا چہرہ ایسا نظر آتا ہے
اک پھول کوئی جنگلی کھلتا نظر آتا ہے

الفت میں ہر اک منظر اُلٹا نظر آتا ہے
چھت سے تیرا دیوانہ لٹکا نظر آتا ہے

موچی تو نہیں جانِ جاناں تیرے دیوانے
ہر شخص کے ہاتھوں میں جوتا نظر آتا ہے

جب ساتھ ترا ہو تو لنگڑا بھی چلے تن کر
اندھے کو اندھیرے میں رستہ نظر آتا ہے

تو ہی نظر آتا ہے شانہ مجھے ہر شے میں
دل تیری محبت میں اندھا نظر آتا ہے

شاہین فصیح ربانی

بہروپیے کا روپ ہے دھارا ترے لیے
طنز و مزاح کا ہے یہ چسکا ترے لیے

اب ہم کو اپنی سرخ بجارو میں چھوڑ آ
چھوڑا ہے ہم نے گاؤں کا تانگہ ترے لیے

ملتی نہیں ہیں اب کہیں کے ٹو کی سگرٹیں
کے ٹو پہ ورنہ گاڑتے جھنڈا ترے لیے

رکھی تھی اس نے اور شرائط میں ایک شرط
میں نہ بنا سکوں گی پراٹھا ترے لیے

ہم کو بنا لے اپنا شریکِ حیات، سُن!
لکھتے رہیں گے شعر وغیرہ ترے لیے

تیرے سکونِ دل کی طلب کے جواب میں
لے آئی ہے وہ گھوٹ کے دھنیا ترے لیے

یہ ظلم ہے فصیحؔ، تو اَن پڑھ اسے نہ کہہ
سیکھا ہے اس نے سینا پرونا ترے لیے

شہناز شازؔی

ہر سمت سیلفیوں کا ہے پھیلا بخار دیکھ
سیل فون کمپنیز کا چڑھتا خمار دیکھ

ہاں عمر میں بڑا ہوں نذیراں تو کیا ہوا
ڈالر میں مل رہی ہے جو مجھ کو پگار دیکھ

بیگم فلرٹ کرنا بھی یونیک آرٹ ہے
تو مجھ پہ شک نہ کر میرا دسواں شکار دیکھ

گھنٹوں کیا ہے ویٹ ترا تپتی دھوپ میں
"تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ"

کیسی بساند پھیلی ہے قرب و جوار میں
ڈالا ہے آج گوبھی کا کس نے اچار دیکھ

آفس میں آج وائے فائے کنیکشن لگا دیا
بیمار سو ہیں ان کے لئے اک انار دیکھ

ان کی نگاہ شکنی کا ہے ایک ہی علاج
وہ ایک بار دیکھے تو تو بار بار دیکھ

گھٹنوں کا درد مول لیا تیرے عشق میں
لنگڑا کے چلتا ہے ترا "اکشے کمار" دیکھ

بجرنگی بھائی جان بنا ویزا پاسپورٹ
کیسے گیا سرنگ سے بارڈر کے پار دیکھ

قوس قزح کے رنگ ہیں سارے فلورسنٹ
ہر رنگ میں بسا مرے ایڈمنز کا پیار دیکھ

دیکھا ہے اس کے بھائی نے دونوں کو ساتھ ساتھ
عزت سے اپنے واسطے جائے فرار دیکھ

شازؔی نہ ہل چلا تو پرائی زمین وچ
بڑھتا ہے اس سے تیرے لہو کا فشار دیکھ

نادیہ سحر

چاہا ہے جب مجھے ، مرا نخرہ اٹھایئے
کنگن اٹھایئے، کبھی جھمکا اٹھایئے

کھانے کا وقت ہو چکا کھانا بنایئے
میں پی چکی ہوں سوپ ، پیالہ اٹھایئے

خود کو سنوارنا ہے ذرا ہیلپ کیجیے
میک اپ کی کٹ کے ساتھ یہ شیشہ اٹھایئے

کھا کھا کے توند بڑھنے لگی دن بہ دن جناب
رکھ دیجیے کباب، مرنڈا اٹھایئے

مانا کہ درجنوں کا ارادہ ہے آپ کا
اس بار کوفتہ ذرا چھوٹا اٹھایئے

اتنے سویٹ ہارٹ کو کڑوا نہ کیجیے
برفی تو کھا چکے ہیں پتیسا اٹھایئے

بس کام کام کام پہ رکھے رہیں یقیں
قائد کے احترام کا بیڑا اٹھایئے

کرنے لگا ہے تنگ اسے خوبرو "چڑا"
چڑیا کی جاں چھڑایئے ، پنجرہ اٹھایئے

لالچی سے کہہ رہا تھا کوئی لونگ یوں سحر
لو مل گیا ہے آپ کا جھمکا اٹھایئے

سیدفہیم الدین

عجب چڑ قتاتی ہیں
یہ جو میرے براتی ہیں

براور بھی ترے جاناں
ازل کے وارداتی ہیں

حسینائیں دفاتر میں
مقدر آزماتی ہیں

کرا کر لفٹ گاے کو
ہمارا دل جلاتی ہیں

ہماری بیویاں پیارے
ہمارا دل جلاتی ہیں

جہانگیر نایابؔ

کوئی قاصد ، نہ کوئی خط،نہ اشارا کوئی
تیرے وعدے پہ ابھی تک ہے کنوارا کوئی

ایک دن دیکھ لیا تھا اسے میک اپ کے بغیر
اب تو باقی بھی نہیں ذوقِ نظارا کوئی

بعد مدت گئی ہوگی تری بیوی میکے
باغ میں پھرتا ہے کب وقت کا مارا کوئی

پیار کا دعویٰ بھی تو ہے مہرِ مطلق کی طرح
توڑ کے لانا ہے کب چرخ سے تارا کوئی

گوشت مچھلی نہ سہی ڈھنگ کی سبزی تو ہو
دال روٹی پہ کرے کیسے گزارا کوئی

پٹنے سے ہم کو بچا لیتا یقیناً اس دن
دشمنوں میں جو وہاں ہوتا ہمارا کوئی

اس کی فرقت میں برا حال ہے اب یہ نایاب
سوکھ کر ہو گیا ہو جیسے چھوہارا کوئی

عارفہ صبیح خان

پیار کی راہ جب نکالی تھی
زندگی کس قدر مثالی تھی

تو نے مجھ کو بھری تھی جب چٹکی
میرے گالوں پہ کتنی لالی تھی

گھیر رکھا تھا تیری یادوں نے
سامنے چائے کی پیالی تھی

سارے ارماں سمیٹ کر دل میں
ہم نے اک بزم سی سجا لی تھی

غمِ دنیا میں خود کو ڈھالا تھا
عمر بھی اپنی لاابالی تھی

گیارھواں باب

ارمان یوسف

لندن ایکسپریس کا ایک باب

کاکس پیٹر ۔۔۔ وہ ھمارا یار

اِن سے ملئے، یہ ہیں ۷۸ سالہ کاکس پیٹر، ہمارے جگری یار۔ لندن کے ایک نواحی علاقے میں اکیلے ہی رہتے ہیں۔ والدین فوت ہو گئے، ایک ہی بہن ہے وہ بھی دور ایک محلے میں اکیلی ہی رہتی ہے۔ پیٹر سے ہماری یاری کب اور کیسے لگی یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔ ایک روز وہ اپنے کسی دوست سے گپ شپ میں مصروف تھے کہ ہم سے ٹاکرا ہو گیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تاریخ اسے ازبر ہے۔ بات کرنے پہ پتہ چلا کہ تاریخ، جغرافیے، جنگلی حیات اور دیگر اہم موضوعات پر تین سو سے زائد ٹی وی پروگرام کی سیڈیز اور سیریل پر مشتمل پچیس سال کا ذخیرہ اس کے پاس موجود ہے جسے اس نے دوستوں کے لئے مختص کر رکھا ہے۔ اپنے ہی گھر پہ وہ دوستوں کی چائے پانی سمیت بیالیس انچ کی سمارٹ سکرین پر یہ پروگرام دکھا کر، دوستوں کو محظوظ ہوتا دیکھ کر خود بھی خوش ہوتا رہتا ہے۔ لاہور ریلوے سٹیشن سمیت پاکستان اور ہندوستان کی تاریخی عمارتوں اور مقامات کی ویڈیو سی ڈی بھی اس کے پاس موجود ہے۔

”کیا آپ کے پاس ستاروں، سورجوں اور کہکشاؤں کے متعلق بھی کچھ ہے؟“ ہم آج اس کے گھر پہ ایک فلم ’لندن کا

فضائی نظارہ" اور" لندن کی جدید عمارتیں"
دیکھنے کو آئے ہوئے تھے۔

"نہیں جناب! میرے پاس صرف زمین
اور اس کے متعلق اشیا کی معلومات ہیں، ستاروں پہ ابھی کمند نہیں
ڈالی!" پیٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ بالکل ہی اکیلے ہیں۔ شادی کیوں نہیں کی؟ کم از کم
آج کچھ بچے تو ورثے میں چھوڑ کے جا رہے ہوتے۔"

اس نے کہا "شادی آپ کی آزادی کے تابوت میں آخری
کیل ثابت ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری آزاد زندگی میں
کوئی مخل ہو۔ ہاں جوانی میں کچھ حسیناؤں کا ساتھ رہا ہے، جیسا کہ
یہاں عموماً ہوتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ شادی کی نوبت نہیں آئی۔"

بھئی آزادی کے سلب ہونے کے ساتھ ساتھ شادی کے اور
بھی درجنوں سائڈ افیکٹ کے ہم خود بھی چشم دید گواہ ہیں۔ جن میں
سے ایک بچوں کی پیداوار ہے۔ ہمارے بڑے بھائی اجمل تبسم
صاحب تو ابھی میٹرک شدہ بھی نہیں تھے کہ شادی شدہ ہو کر شدھ
بدھ ہو گئے۔ اور پھر پے در پے اکرم خان المعروف بھولے سرکار
اور صابر خان کی شادی نے بھی گھر میں بچوں کا میلہ سا لگا
دیا (اطلاعاً عرض ہے کہ ہم ابھی تک کنوارے ہیں اور اس بے ضرر
سی اطلاع کو شادی کا اشتہار سمجھنے والیاں نتائج کی ذمہ دار خود ہوں
گی) ہوا یوں کہ گذشتہ برس ہم ایک مدت بعد پاکستان واپس گئے
تو سوچا گھر والوں کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں کریں گے، سرپرائز
ہی سہی۔ شام ڈھلے گھر پہنچے، جو کافی بڑا اور بدلا بدلا سا لگ رہا
تھا۔ دور سے گلی میں کھیلتے اجنبی بچوں کو دیکھا تو سمجھے کہ گھر والے
یک طرفہ ٹکٹ کٹا کے باقی زندگی مریخ پہ گزارنے چلے گئے ہیں اور
ایک روز وہیں سے ہی فون کر کے سرپرائز دیں گے۔ لیکن مریخ پہ
بسنے والی کالونی تو ۲۰۲۴ء میں آباد ہونی شروع ہو گی، انہیں کیا جلدی
تھی۔ اجنبی بچے بھی گھبرا کے گھر کو دوڑ گئے جو شاید پہلی بار چاچو
میاں کو دیکھ رہے تھے۔ ادھر ہمارے خالہ زاد بھائی عثمان اور ابوبکر
نے شاید ہمیں شام کے سائے میں گھر کی چار دیواری کی طرف
بڑھتے دیکھا تو بڑے بھائی صاحب کو اطلاع کر دی کہ ہوشیار رہنا
کوئی مشکوک شخص آپ کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ گھر
والے کسی ممکنہ خطرے سے نپٹنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ
اچانک ہم جا پہنچے۔ ماں نے تو چوم چوم کے ہی تھکان اتار
دی۔ اتنے سارے بچے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ شاید گھر والوں کو بھی
ہمارے آنے کی خبر مل گئی ہو گی اور فوری طور گلاب کے پھول نہ مل
سکنے پر خیر سگالی اور ہمارے استقبال کے لئے محلے بھر کے پھول
سے بچوں کو جمع کر لیا گیا ہو گا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ

سارے "مظلوموں" سے ناطہ ہے ہمارا بیدلؔ
سارے "مظلوموں" کے بچے ہیں ہمارے بچے

اِدھر کاکس پیٹر نے لندن کا فضائی نظارہ دکھانے کے ساتھ
ساتھ لندن کی جدید عمارتوں والی ویڈیو سی ڈی چلا دی، جس کا ایک
حصہ لندن کے نواحی علاقے میں قائم ایک مندر سے متعلق تھا جو
ہندوستان سے باہر کسی بھی ملک میں سب بڑا مندر ہے۔ اس ویڈیو
کا نام "لیبر آف لو" رکھا گیا تھا۔ مندر کی دودھ سی دھلی سفید عمارت
قریب سال بھر میں مکمل ہوئی اور اس کا سارا مواد ہندوستان سے
لایا گیا تھا اور یہاں فقط اسے جوڑا گیا جو عقیدت مندوں نے مفت
میں کام کر کے اسے مکمل کیا۔

"میں جب بھی اس عمارت کے اندر جاتا ہوں، مجھے بہت سکون ملتا ہے!" پیٹر نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

مندر کے باقاعدہ افتتاح سے قبل لندن کی گلیوں میں ثقافتی رقص بھی کیا گیا اور ہندوستان کے سب بڑے گرو اور مذہبی قائد کو خوش آمدید بھی کہا گیا۔ ویڈیو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ کس قدر دیوانگی، وارفتگی اور عقیدت مندی کے ساتھ اپنے محبوب قائد کی صرف ایک جھلک دیکھنے کی خاطر ہندو یاتری بے تاب ہو رہے تھے اور اس کی ایک نظرِ عنایت کو اپنی زندگی کا خوبصورت ترین لمحہ سمجھ رہے تھے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ دیوی یا دیوتاؤں کے مجسموں کی اس وقت تک پوجا پاٹ نہیں کی جاتی جب تک کہ مذہبی رہنما مخصوص رسموں کے ذریعے ان بتوں کو دیوتاؤں کی روحوں کا مسکن نہ بنا دے۔ اور پھر لوگ دیوانہ وار ان کی پوجا کرتے، ان سے محبت و عقیدت رکھتے اور ان سے حاجت روائی اور بھلائی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ شاید اسی دن کو دیکھنے کے لئے قرآن نے ہمارے لئے یہ فرمایا، جس کا ترجمہ ہے:

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اوروں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر ان سے ایسی ہی محبت رکھتے ہیں جو کہ اللہ سے رکھنی چاہیئے۔" ۲:۱۶۶

مذہب اور عقیدہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی خاطر انسان اپنی جان تک دے دیتا ہے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ کیونکہ وہ مذہبی رسومات پر صدیوں سے اجداد کو کاربند دیکھتا ہے تو آنکھیں بند کر کے یقین کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس لئے قرآن میں یہ بھی کہا گیا کہ لوگوں کو حکمت کے ساتھ راہِ حق کی طرف بلاؤ۔ ثابت ہوا کہ ایک سفری بیگ اور لوٹا ہی تبلیغ کے لئے بنیادی ضرورت نہیں بلکہ صاحبِ علم و فہم ہونا اور لوگوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ایک خیر خواہ اور بھلائی چاہنے والے کی طرح صبر اور حکمت کے ساتھ مستقل مزاجی بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں تو الٹی ہی گنگا بہہ رہی ہے، کوئی بھولے سے کسی دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے نماز پڑھ لے تو گھر واپس جا کر اپنی نماز دوبارہ ادا کرتا ہے۔ مفتی حیات حسین (پشاور والی سرکار) بجا طور پر فرماتے تھے کہ جن باتوں پہ ہم سب مسلمان متفق ہیں اور اکثر باتوں پہ ہم متفق ہیں، ان پر مکمل طور سے عمل پیرا تو ہوں، اختلافی اور فروعی مسائل کو بعد میں دیکھیں گے۔

شیخ ابراہیم ذوق کی دلی اور ہمارا ذوق استاد ابراہیم ذوق نے دہلی کے بارے میں بجا فرمایا تھا۔

ان دنوں گرچہ ہے دکن میں بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

لندن کی مخمور ہواؤں اور پر رونق کلبوں اور بازاروں نے اگرچہ ہمارے دل کو خوب لبھائے رکھا مگر برمنگھم کی جانب بڑھنا بھی اب ضروری ہو گیا تھا۔ وہاں عباس ملک ہماری راہ دیکھ رہے تھے اور ہماری آنکھیں برمنگھم کے نظاروں کو ترس رہی تھیں۔ لہٰذا مختصر سفری سامان سمیٹا اور سنٹرل لندن میں واقع وکٹوریہ کوچ سٹیشن

کہا جاتا ہے کہ علماء کے نزدیک راگ نامقبول سی شے ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ یہ قوالی اس فتوے کے زد سے کیسے بچ گئی اور فقط بچ ہی نہیں گئی بالکل اسلام بی بی بن بیٹھی ہے۔ اور جب چاہے' جہاں چاہے امیر خسرو سے لے کر اقبال کے کلام تک ہر ایک کے شعر پر دست درازی بلکہ زبان درازی کر سکتی ہے۔ اقبال کے کلام پر تو اس کا ڈاکٹر جاوید اقبال سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کی دسترس سے فقط کلام پاک ہی محفوظ ہے کہ خود ذاتِ باری اس کی محافظ ہے' ورنہ کئی قوال آج بھی سورہ رحمان پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے رہتے ہیں۔

حضرات! مجھے قوالوں سے کوئی عناد نہیں۔ اگر قوالی مذہبی لبادہ اتار دے تو میرے نزدیک یہ ایک اچھا اور صحت مند تماشا ہے جس سے کئی لوگ خصوصاً بچے محظوظ ہو سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے تفریح کے مواقع یوں بھی کم ہیں۔

بزم آرائیاں از کرنل محمد خان

سے برمنگھم کو روانہ ہوئے۔ یو کے میں ایک تو سفر کرنا مہنگا ہے اور دوسرا رہائش۔ ہاں البتہ کھانا پینا سستا ہے۔ دو پاؤنڈ بھی جیب میں ہوں تو ایک وقت کا کھانا پیٹ بھر کے کھایا جا سکتا ہے۔ ذرا سی منصوبہ بندی کی جائے تو سفر کرنا بھی آسان ہو سکتا ہے۔ یہاں سفر کا اہم اور تیز رفتار ذریعہ ٹرین ہے جو مہنگا ہے مگر ایڈوانس میں ٹکٹ لے کر یا رعایتی سفری کارڈ بنوا کر آپ بچت کر سکتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ بسیں ہیں۔ نیشنل ایکسپریس سب سے بڑی ٹریولنگ سروس ہے۔ میگا بس بھی چلتی ہے جو کم خرچ اور بالا نشیں ہے۔ ٹکٹ خریدنا بھی چٹکی بجانے جیسا ہے اگر بجانا آتی ہو تو۔ آن لائن ٹکٹ بک کیجیے اور ای میل یا موبائل پر کمپنی کی طرف سے Auto Generated ملنے والے مخصوص ریفرنس نمبر کو ڈرائیور کو دکھایئے اور کسی بھی من پسند سیٹ پر بیٹھ جایئے۔ یوں تو ہر سٹیشن پر لگی ٹکٹ مشین یا ٹکٹ آفس سے بھی ٹکٹ لیا جا سکتا ہے جو نسبتاً مہنگا ملتا ہے۔ ہاں مگر ڈرائیور سے ایسی مہربانی کی امید نہ رکھیے گا۔ اس کا کام بس گاڑی چلانا اور ٹکٹ چیک کرنا ہے۔ ٹکٹ دینا نہیں۔ یہاں ڈرائیور بھی 3 in one ہوتا ہے۔ یعنی کنڈیکٹر اور کلینرز کے فرائض بھی ڈرائیور ہی انجام دیتا ہے۔

''کہاں جانا ہے سر؟''

''برمنگھم۔''

ٹکٹ چیک کرانے کے لیے ڈرائیور کے جواب کے ساتھ ہی ہم نے اپنا موبائل بھی آگے بڑھا دیا جسے چیک کرتے ہی وہ بولا!

"Welcome onboard"

ڈرائیور کا شکریہ ادا کرتے ہی ہم نے نیشنل ایکسپریس کی بس پہ قدم رکھا۔ جہاز جیسی بڑی اور آرام دہ عمدہ چمڑے کے غلاف میں لپٹی سیٹیں اکثر خالی تھیں۔ ہم نے کھڑکی والی سیٹ کا انتخاب کیا اور سامان رکھتے ہی ڈھیر ہو گئے۔ بس کے چلنے میں ابھی ۱۰ منٹس باقی تھے۔ کئی مسافر ابھی سوار ہو رہے تھے۔

"May I sit here please"

ایک ماہ جبیں نے برابر والی سیٹ خالی پا کر پوچھا۔ ہم نے بھی نہ صرف سیٹ کی طرف اشارہ کیا بلکہ اس کے لئے دل کا دروازہ بھی کھول دیا۔ کب سے خالی تھا، سوچا آنے والے کو دستک دینے کی زحمت بھی نہ اٹھانی پڑے۔

کچھ ہی دیر میں بس چل پڑی۔ ڈرائیور نے تمام مسافروں کو خوش آمدید کہا اور ناگہانی صورتحال سے نمٹنے، گاڑی کے آخری کونے میں موجود ٹوائلٹ استعمال کرنے کی ہدایات اور ساتھ ہی دیگر مسافروں کو اونچا میوزک یا موبائل استعمال نہ کرنے کی درخواست کی۔ نیشنل ایکسپریس نامی یہ بس کمپنی نہ صرف یو کے میں چلتی ہے بلکہ سپین، کینیڈا اور امریکہ کی سڑکوں پر بھی دوڑتی ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر برمنگھم میں ہے۔ یہ یورپ کے طویل ترین سفر بھی کرتی ہے۔

لندن کی بھول بھلیوں سے ہم موٹر وے پہ آ گئے۔ اتنے میں ساتھ بیٹھی گوری اوور کوٹ اتار کے سیٹ کے پیچھے لگا چکی تھی۔ بس کی ہلکی ہلکی روشنی میں پتلی سی ٹی شرٹ میں وہ یوں چمک رہی تھی جیسے اندھیری راتوں میں ندیا کے اس پار چاند دمکتا ہے۔ مگر وہ تو پہلو میں جلوہ نما تھی۔ اب تک تو بس میں لگی ایک بڑی سی سکرین پر ہم بس کے اندر اور باہر کے کیمروں کے ذریعے ارد گرد کا نظارہ کر رہے تھے مگر چراغ تلے تھوڑی روشنی ہوئی تو پاس ہی کے نظارے میں کھو گئے۔

''کتنی سندر لگ رہی ہیں آپ!''

''شکریہ! آپ بھی بہت خوبرو ہیں!''

ہمیں بھی اس گورن سے اسی جواب کی توقع تھی۔

اگر یہاں کوئی پاکستانی مٹیارن ہوتی تو ''عزت افزائی'' کسی اور طرح سے ہوتی۔

ہم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا جسے سوزی نامی اس حسینہ نے بڑے پیار سے تھام لیا اور بس، یہیں سے اس کی کیسٹ بھی چل پڑی۔ وہ کل ہی فرانس سے آ رہی تھی، اور لگی سنانے سفر کا احوال۔ یہ گورے بھی عجیب ہیں۔ دلچسپی نہ لو اور گفتگو کا آغاز خود نہ کرو تو چاہے عمر بھر ساتھ رہیں، چپ ہی رہیں گے اور اگر بات شروع کر دو تو داستان لے کے بیٹھ جائیں گے۔ ہمیں تو اس کے گلاب سے کھلتے چہرے کو تکنا اچھا لگ رہا تھا اور بات بے بات ہاتھ پہ ہاتھ بجانا بھی۔ آدھی باتیں سمجھ میں آئیں اور آدھی نہیں۔ لگتا تھا سوزی بولتے بولتے تھک گئی ہے۔ اس نے

سیٹ سے سر لگاتے ہوئے کہا کہ کچھ دیر کو سونا چاہتی ہوں۔ ہم بھی پاکستانی مجنوں ہیں،، سر رکھنے کو اسے بازو تو پیش نہ کر سکے، البتہ کندھا حاضر کر دیا۔ وہ بھی لڑھک گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اونگھنے لگی ۔نجانے گزشتہ شب کے رتجگے کا اثر تھا یا اس کی موجودگی کا خمار، ہماری آنکھوں میں بھی نیند اترنے لگی۔ حالانکہ ایسے موقعوں پہ تو بند آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں۔

مانوس سی آواز سنی تو آنکھ کھل گئی۔ سوزی پہلے ہی جاگ چکی تھی مگر ہماری خاطر ٹس سے مس نہ ہوئی کیونکہ اب کے ہمارا سر اس کے کاندھوں پہ تھا اور ہاتھ اس کی گود میں۔ ہم کوونیٹری پہنچ چکے تھے۔ لندن سے ۹۳ میل کے فاصلے پہ واقع یہ شہر ویسٹ میڈ لینڈ کاؤنٹی کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ جسے ماضی میں چمڑے اور کپڑے کی مصنوعات کے حوالے سے اہم مقام حاصل رہا ہے۔ سائیکل کی تیاری میں بھی یہ شہر برطانیہ بھر میں مشہور ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں ایمبولینس سروس کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا۔ پہلی جنگ عظیم میں یہ شہر دشمنوں کے حملوں کی زد میں رہا۔ رہی سہی کسر دوسری جنگ عظیم نے پوری کر دی۔ پورے کا پورا شہر بمباری کی وجہ سے تباہ ہو کے رہ گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد گوروں نے دوبارہ اس شہر کو پہلے سے بھی بہتر آباد کیا۔ پاکستانی حکمران ہوتے تو کبھی نہ بھرنے والا گدائی کا خالی کاسہ لے کر ایک بار پھر شہر کے کھنڈرات دنیا والوں کو دکھا دکھا کر مانگنے کا نادر موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ سچ ہے کہ منگتے ہمیشہ منگتے ہی رہتے ہیں۔ اپنے پیٹ کا ایندھن بھرنے کی خاطر، عوام کی کسے پرواہ ہے۔ عوام بھی تو ایسی ہی ہے، اندھے جذبات کی ماری اور بیوقوف۔

بس شہر کی سڑکوں سے گزرتی دوبارہ اپنی منزل کو روانہ ہو چکی تھی۔ سوزی کی قربت نے ہر منظر کو خوبصورت بنا دیا تھا۔ موٹر وے جب کسی دیہات کے پاس سے گزرے تو قدرتی اور خوبصورت مناظر دل موہ لیتے ہیں۔ ارد گرد سبز ہریالی گھاس پہ چرتے جانور اور اونچی نیچی پہاڑیوں پہ اگتے رنگا رنگ پودے اور اِکا دُکا مکانات اپنی مثال آپ۔ جانوروں کو اکیلا چرتے دیکھ کر ایک بار تو جی چاہا کہ دو چار کو ہانک لیں۔ مگر سوزی کا ہاتھ چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ ویسے تو کوئی چرواہا بھی آس پاس نہیں تھا سوزی نے بتایا کہ جانوروں کے گلوں میں جی پی ایس (گلوبل پوزیشنگ سسٹم) ٹیگ لگا دیتے ہیں اور گھر میں بیٹھے ہی لیپ ٹاپ یا موبائل پر نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے میں ہماری ڈکیتی ناکام جاتی تو؟

یوں تو سوزی نے اور بھی بہت کچھ کہا اور سنا بھی۔ مگر آپ سے مطلب؟ کچھ باتیں پرائیویٹ بھی تو ہوتی ہیں۔

گاڑی ایک بار پھر رک چکی تھی۔ کھڑکی سے اس پار لمبی لمبی ناک والے جہاز صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم ''برمنگھم انٹرنیشنل ایئرپورٹ'' پر پہنچ چکے تھے۔ اس ایئرپورٹ نے ۱۹۳۹ء میں برمنگھم سٹی کونسل کے زیر انتظام کام کرنا شروع کیا تھا جبکہ دوسری جنگ عظیم میں رائل نیوی اور رائل ایئر فورس کے کنٹرول میں آ گیا اور تربیتی اور فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔ ۱۹۶۰ء میں پھر سول انتظامیہ نے اس کا کنٹرول سنبھالا اور ۱۹۶۱ء میں بین الاقوامی ہوائی سروس بھی شروع کی گئی۔ تب سے اب تک ہوائی اڈے کی توسیع بھی ہوتی رہی اور تزئین و آرائش بھی۔ "Towards 2030" پروجیکٹ کے تحت بڑے پیمانے پر توسیع کا کام جاری ہے۔ ایئرپورٹ سے ۱۹ میل کی مسافت پر برمنگھم شہر واقع ہے۔ یہ فاصلہ بھی جلد ہی طے ہو گیا۔ جیسے ہی فٹ بال بلڈنگ پہ نظر پڑے سمجھئے کہ منزل آ گئی۔ برمنگھم کوچ سٹیشن پر اترتے ہی سوزی نے الوداع کہا اور ایک جمِ غفیر میں کھو گئی، ہمیشہ کے لیے!

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح اِن کا سلوبِ بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفر نامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اوّلین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

پہلی لڑی

سفر وسیلۂ ظفر

عنصر شبیر

اچھا تو آپ اوپر جا رہے ہیں؟

چلتے ہو تو کے۔ٹو کو چلئے

اچھا! تو آپ ہیں وہ جو ''اُوپر'' جا رہے ہیں؟ اُنھوں نے ایسے جائزہ لیا، جیسے عید قربان پر بکرا منڈی میں بکروں کو گہری نظروں سے دیکھتے ہیں۔۔۔آنے والے کچھ دنوں میں یہ ڈائیلاگ ہمارے سامنے بہت دھرایا گیا۔

سکردو کے ''شیراز ہوٹل'' میں ''گل خاں'' نے تو حد نالوں وی ود کردی ''وائے بٹ صیب؟ اے تم اوپر جاتی اے۔۔۔اوپر تو موت کھڑا اے۔۔۔''

''کیوں؟ کیا ہوا ہے اُوپر؟'' میں اندر سے ذرا دہل سا گیا

''گل خان! ہم پہاڑوں پہ جا رہے، آسمان پر نہیں کہ اوپر موت کھڑی اے!'' میں نے آخری فقرہ گل خاں کی نقل اتاری تو توقع کے برخلاف گل خاں نے ذرا غصہ نہ کیا۔وہ اپنی ہی روانی میں بولا ''ابھی تم کو مذاق آتی اے، جب اوپر، اوپر جائے گی تو بولے گی وائے گل خانہ ٹھیک بولتا تھا۔''

خانہ تنگ خود کو مذکر اور ہم جوان جہان ڈشکروں کو مونث بنائے چلا جا رہا تھا ''وئے! تم کو اسٹیچر بنانا آتی اے؟''

''نہیں!''

''ہاہاہا، پیکر نا ئیں کرونا، اَم سیکھائے گا، دیکھوناں بھائی! اوپر کوئی بیمار و بیمار پڑھ گیا یا پھررررر۔۔۔''

ساری ٹیم جو کہ ہمارے اِردگرد اکٹھی ہوگئی تھی اُن کے چہروں کی ہوائیاں ''پھرررر'' کہنے سی اُڑ چکی تھیں۔اُن کو مزید ڈرانے کو

گل خان بولا ''بٹ صیب! موت کا وقت ایک دم فکس، اور جگہ بھی، ہی ناں۔۔۔ ہر مسلمان کا ایمان اے نا؟''

ساری ٹیم نے ہاں میں سر ہلا کر اپنے ''مومن'' ہونے کا ثبوت دیا۔

''تو برادر! اوپر کسی کو کچھ ہو جاتی اے تو۔۔۔''

اب کے وہ اپنی منحنی سی گردن ہلا ہلا کے ہر ایک کے خوفزدہ چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''تو تم پیکر متی کرو، گل خان اے ناں۔''

ساری ٹیم کے تو جیسے دم میں دم آیا، جبکہ میری تو جیسے دُم پہ کسی نے پیر رکھ دیا ہو، پھدک کے کرخت لہجے میں بولا ''کیا مطلب؟''

اِدھر میرے ساتھیوں کے خوفزدہ چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُنہیں میری ''دخل در معقولات'' پسند نہیں آئی۔ اُدھر گل خان مجھ سے ناامید ہو کر ''رشید صاحب'' کا بازو پکڑ کر زور سے ہلاتے ہوئے بولا ''دیکھو ناں بھائی! اوپر اگر کسی کو کچھ ہوتی اے تو؟ تو اس بے چارے کو اُدھر ای تو چھوڑ کر نہ آئے گی، توبہ توبہ، بٹ صیب اب تم ہی بتاؤ! واپسی پر اس بھائی کے بچہ لوگ کو کیا منہ دیکھائے گی۔۔۔؟''

گل خاں کا یہ وار بہت کارگر رہا۔ رشید صاحب نے تو ایک جھٹکے سے اپنا بازو گل خاں کے ہاتھ سے چھڑوایا جو کہ اسے مسلسل زور زور سے ہلائے چلا جا رہا تھا اور خوفزدہ ہو کر فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگے، اپنا بوریا بستر لپیٹتے جاتے ہیں اور منہ ہی منہ میں ''بڑ بڑ'' کیے جاتے ہیں۔

ایسے میں گل خان ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں ہاتھ فضا میں بلند کر کے بولا ''مگر! مگر تم پیکر متی کرو، گل خان اے ناں!''

سب کے اپنے اپنے کمروں کی طرف جاتے اُلٹے خوفزدہ قدم رک گئے، اور مسکین و مجبور صورتیں بنائے گل خاں کو خدائی مددگار کی صورت ٹکر ٹکر دیکھنے لگے اور میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی، کرنل منور صاحب بھی کہیں ہوٹل سے باہر گئے ہوئے تھے اور سچی بات یہ کہ میں بھی اندر سے ذرا سا ڈر ہی تو گیا تھا مگر ہمت جمع کر کے آواز کو کڑک بناتے ہوئے غصے سے بولا ''نہ تو تم وہاں کیا کر لو گے ہمارے لئے؟''

''خوچہ! تم مسلمان، ام مسلمان، تمہارا مدد کرنا امارہ ذمہ داری، ام تم کو لے کر جائے گا کے ٹو۔۔۔''

''ام تم کو لے کر جائے گا کے ٹو۔۔۔'' میں اس کی نقل اُتارتے ہوئے بولا ''نہ تم ہماری اِدھر کیا مدد کرے گا، کھل کر بات کرو گل خان!''

اب کے میں اپنی گھبراہٹ پہ قابو پا چکا تھا، جبکہ ساری ٹیم مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی کہ اک ''بھلا مانس'' آدمی ہماری مدد کر رہا ہے اور یہ صاحب ہیں کہ اپنی ہی اکڑفوں دکھا رہے ہیں۔ ساری ٹیم کے پریشان کن خوفزدہ چہروں پر نظر دوڑائے ہوئے گل خاں نے اپنا آخری پتہ پھینکا۔

گل خاں بولا ''ناں! ام تمہاری مدد کرے گا، تم کو اوپر لے کر جائے گا، تم کو آندھی کھائیوں میں بالکل نہ گرنے دے گا۔۔۔ اور تو اور مرو گے بھی نہیں اور زخمی بھی نائیں ہونے دے گا، بالکل نائیں ہونے دے گا، اس کے بدلے لے گا صرف اور صرف پاندرہ ہزار۔۔۔ ماڑا پاندرہ ہزار روپیہ زندگی سے قیمتی تو نائیں اے ناں۔''

''اُوپر پہاڑوں میں تم خدا لگے ہو کیا؟'' میں ابھی کچھ بولنے کو اٹھا ہی تھا کہ میرے پیچھے سے ''کرنل منور صاحب'' کی کڑک دار آواز کمرے میں گونج اٹھی تو کائیاں گل خان ٹھٹک گیا۔ ادھر بقایا ساری ٹیم انتہائی خوف زدہ آنکھوں اور پریشان چہروں سے کبھی گل خاں کی طرف دیکھتی تھی، کبھی میری طرف دیکھتی تو کبھی کولہوں پر دونوں ہاتھ جمائے دروازے میں بالکل سیدھے کھڑے کرنل منور حسین صاحب کو بٹر بٹر دیکھتی اور لاشعوری پلکیں جھپکاتی ہوئی۔

ایک لحہ کو گل خان کی آنکھوں میں گھبراہٹ آئی مگر کائیاں آدمی تھا، فوراً سنبھل گیا اور چشما ٹور رفیق سے بولا ''وائے خوچہ! اپنا آنکھیں چیک میک کروا لو یارا، ادھر امارہ علاقہ میں ''سنو بلائنڈ نیس'' بڑا آسانی سے ہو جاتا اے!''

"لے دس! اوے خانہ ٹنگا، ابھی تو ہم نے "سنو" دیکھی ای نہیں۔۔۔" بلال اپنا بھاری ہاتھ ماڑی جان گل خان کے کندھے پہ مارتا ہوا ہنسا تو اس کا چھلکتا پیٹ بھی ہنسنے لگا، تھل تھل زلزلہ کے مافق لرزنے لگا۔ اس دھپے کا گل خاں نے ذرا غصہ نہ کیا الٹا اپنے کندھے کو ذرا سا سہلاتے ہوئے بولا "خاہ! یہ جو سامنے پہاڑ کا چوٹی پہ سنوا ے ناں، ماڑا اس کو دیکھتی نہیں او کیا؟"

بلال کا چھلکتا، لرزتا ہوا پیٹ، قہقہہ ابلتا ہوا وڈا سا منہ جہاں تھا وہیں رک گیا کہ جیسے وہ سنوا بھی اسکو اندھا کر دے گی۔

"اور ہاں! ہک بات اور اے، وئے یارا! اوپر۔۔۔ اُوپر ہاتھ اور پیر کا ادھر "فراسٹ بائیٹ" بھی تو ہوئے گا ناں۔۔۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" عبدالحمید منمناتی ہوئی آواز میں بولا تو گل خان کڑک کے بولا "یہ بڑا احرام خور ہوتا اے، یارا دیکھو! اگر ہاتھ پاؤں کا انگلیاں سیاہ، ماڑا مطلب اے کالی ہو رہا ہو تو اس کو "بابا لوگ" فراسٹ بائیٹ بولتا اے۔۔۔ اور پر تم کو ہو گیا نا فراسٹ بائیٹ تو فوراً چاقو سے انگلیاں کاٹ کر پھینک دو۔" گل خان اپنی انگلیوں کو ڈھیلا چھوڑ کر ہوا میں نچاتے ہوئے بولا۔

"بے کار، ماڑا بالکل بیکار، بیکار ہو جاتا اے نہ۔۔۔ بالکل۔۔۔ کریم خاں کی مافق بیکار۔۔۔"

"تو اُدھر گل خان تم کو فراسٹ بائٹ سے بھی بچائے گا ناں؟"

"ہاں تو پھر کیا بولتا اے تم؟"

"یہ۔۔۔ یہ کریم خان کون ہے؟" عبدالحمید بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بولا تو گل خان اس دخل درنا معقولات پر پہلی مرتبہ تپ کر بولا "ماڑا تم نے کیا لینا اُس بیکار آدمی سے، ایک دم بیکار، ہاں پھر تم کیا بولتا اے، پاندرہ ہزار میں زندگی، کوئی مہنگا سودا نہیں ہے!!"

"ہم یہ بولتا ہے کہ ابھی تم اِدھر سے رفو چکر ہو جاؤ، تمہاری ضرورت ہوئی تو ضرور بلائیں گے تمہیں۔۔۔" کرنل صاحب نے کہا مگر گل خان ڈھیٹ بن کر کھڑا رہا اور ڈری، سہمی ہوئی ٹیم کو متوجہ کر کے بولا "ٹھیک اے! ام نائیں جاتا، مگر! ایک بات بول

اقرا اور حرا دونوں سہیلیاں بہت شرارتی تھیں۔ آج انہیں پھر موقع مل گیا تھا۔ گرمی کی چلچلاتی دوپہر میں مہمان کا نزول ہوا تھا۔ انہوں نے گاؤں سے آئے مہمان کے سامنے جب کھانا رکھا تو ساتھ نیپکن بھی رکھ دیے اور چھپ کر دیکھنے لگیں۔ مہمان نے نیپکن اُٹھایا اور دستر خوان سے روٹیاں نکال کر نیپکن میں لپیٹ کر رکھ دیں۔

کائنات بشیر، جرمنی

دوں، گل خان کے بغیر اُدھر موت اے موت، چہ، چہ۔۔۔ کیسا کیسا کٹر، تا گڑا جوان اے۔۔۔ مگر گل خان کے بغیر۔۔۔ قدم قدم پہ ادھر موت اے نا یارا۔۔۔ مرے گا تم۔۔۔ اُدھر، اوپر مرے گا۔۔۔ چہ، چہ۔۔۔ وئے ادھر موت اے، موت تمہارہ انتظار کرتا اے۔۔۔ جاؤ، جاؤ۔۔۔ گل خان کی بغیر جاؤ۔۔۔ بعد میں نہ اُدھر ام کو یاد کر کے رونا۔۔۔ ام پہلے بولتا اے۔۔۔ تم پھر سوچو! صرف پاندرہ ہزار میں زندگی، ماڑا کوئی سودا مہنگا نائیں اے۔۔۔ سوچو۔۔۔ اک بار پھر سوچو!!!"

اور ٹیم کی تو وہ حالت کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں، جیسے عزرائیل فرشتے کو دیکھتے ہوں کہ اب جان نکالے کہ تب نکالے، ایسے میں کرنل صاحب آگے بڑھے گل خان کو گردن سے پکڑا اور بولے "ہماری موت اوپر ہوگی کہ نہیں ہوگی، تمہارا تو میں اِدھر ہی پٹاخہ بجاتا ہوں۔۔۔"

گل خان لحہ بھر کو خوفزدہ ہوا، پھر اک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑائی اور دور جا کھڑا ہو کر اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا "سوچو! اک بار پھر سوچو۔۔۔ پاندرہ ہزار ہزار چاہئیے یا زندگی؟ وئے اللہ کے بندو! اوپر موت اے، موت۔۔۔"

کرنل صاحب نے اسے دبکا مارا تو وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گیا، لحہ بھر بعد پھر نمودار ہوا، ایک کارڈ کمرے کے اندر پھینک کر یہ کہتے ہوئے بھاگ گیا "پاندرہ ہزار کیا اے؟، زندگی سے قیمتی نائیں اے، اک بار پھر سوچو، یہ میرا کارڈ اے، ابھی جاتا ہوں، پھر آؤں گا۔۔۔"

میرا تو گل خان کے ڈھیٹ پن پہ ہنس ہنس کے برا حال ہو گیا جبکہ ٹیم بوتھے لٹکائے "صم بکم" کی تصویر بنی رہی، کبھی میری

طرف اور کبھی غصہ میں آئے کرنل صاحب کی طرف دیکھتی۔

اِس گل خان سے لگ بھگ تین مہینے پہلے راولپنڈی سے میرے جگری یار ''میاں طارق'' کا دن فون آیا تھا ''کیا کر رہے ہو؟''

''فارغ۔۔۔''

''پھر بھی؟''

''فارغ۔۔۔ازل سے ابد تک فارغ!''

''جنوں کی فصل پک کے جوان ہو رہی ہے کیا؟''

''ہاں یار! تنگ آ گیا ہوں میں اس زندگی سے، روز ناشتہ کر کے دفتر، پھر دفتر سے گھر، رات کا کھانا، بیوی اور ٹی وی کی چخ چخ اور پھر بستر پر سو مر جانا۔ انسان ہوں مگر میری زندگی کولہو کے بیل کی مانند ایک مخصوص دائرے میں ہی مسلسل گھومتی چلی جا رہی ہے۔۔۔ کیوں میاں طارق، یار آخر کیوں؟ اوے یارا میرا کچھ سوچ۔''

میاں طارق ہنس دیا ''ایک تم ہی نہیں تنہا، یار میرا بھی ہر شریف آدمی کی طرح یہی حال ہے، گھر۔۔۔ بنک۔۔۔ بیوی۔۔۔ ٹی وی۔۔۔ یار میری زندگی تو ان چار لفظوں کی قیدی ہو کر رہ گئی ہے۔ عنصر تم فون بند کرو میں تمہیں دو گھنٹے تک فون کرتا ہوں!''

''اوے اوے خانہ ٹنگا! کیا کرنے جا رہا ہے؟''

''بٹ صاحب! میں ان خانہ بدوشوں کی تلاش میں نکلنے لگا ہوں جن کے خیموں کے نیچے گھاس بڑی ہو گئی ہے اور اب وہ بھی اس گھاس سے تیری طرح بیزار ہیں، آوازار ہیں'' یہ کہا اور فون بند کر دیا۔ اور پھر ٹھیک تین گھنٹے بعد اس کا دھماکے دار فون آیا ''بٹ صاحب! کے ٹو جاؤ گے؟''

''اوئے پاگل خانے! کے ٹو جاتے نہیں پیتے ہیں، کے ٹو سگریٹ، پیتے ہیں۔۔۔''

''چہ چہ، اوئے ہوئے بٹ صاحب! سگریٹ نہیں، پہاڑ، پہاڑ، سمجھ آئی، پہاڑ، کے ٹو پہاڑ کے بیس کیمپ چلو گے؟''

''ہیں؟''

''آھو!'' وہ مسکرا دیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا ''نہیں یار۔''

''کیوں؟''

اب اس ''کیوں'' کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا کہ اس سے پہلے میں بڑی بڑی ڈینگیں مار چکا تھا کہ میں نے فلاں ہائیک کی، فلاں ہائیک کی۔۔۔ ذرا سا جھجک کے بولا ''یار اے کچھ زیادہ خطرناک ٹریک نہیں؟''

''ہاہاہا، لے دس! اوئے بھولے بٹ! کون سا ٹریک خطرناک نہیں ہوتا۔۔۔ تمہارے دفتر سے گھر تک کا ٹریک بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ کے ٹو ٹریک!''

میں سمجھ گیا بے چارہ میاں طارق دھوپ میں بائیک پہ بنک سے آ رہا ہوگا اور وہ پنکچر ہو گئی ہو گی، دماغ گھوم گیا ہوگا بے چارے کا، جبکہ وہ اپنی ہی دھن میں بولے چلے جا رہا تھا ''یار عنصر! گھر سے نکلو تو نہ جانے کس وقت، کدھر سے، کب کوئی ٹرک، بس، کار، موٹر سائیکل والا، حتیٰ کہ سائیکل سوار آپ پہ چڑھ دوڑے، نہ یہ جو روز سڑکوں پہ ایکسیڈنٹ خلقِ خدا میں مرتی ہے کیا انہیں بھی کے ٹو ٹریک مارتا ہے؟ ویسے بھی اوئے بٹا! قسم نال سڑک پر مرنے سے بہتر ہے کہ بندہ کے ٹو ٹریک پہ مرے، آئے ہائے، کیا حسین موت ہو گی یار۔۔۔ کی خیال اے فیر؟''

''اوپر یارا!''

''یار تم یہ کب سے ''پرشر'' کے چکروں میں پڑنے لگے، لگدا اے بٹ بڈھا ہو گیاں ایں، اوئے بٹا۔۔۔ سوچ! کے ٹو پہ موت بھی کتنی حسین اور دلکش ہو گی۔''

یہ سننا تھا کہ میرے اندر جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔

''ٹھیک اے یارا میں۔۔۔ میں کے ٹو جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔۔۔ اساں تی کے ٹو نال کوئی لڑائی ہوئے سی کہ کے ٹو نہ جاساں۔۔۔ اوئے میاں طارق تیاری پھڑ۔۔۔ میں کے ٹو جاساں تے ضرور جاساں۔۔۔ کے ٹو۔۔۔ کے ٹو۔۔۔ اوئے کے ٹو۔۔۔ تیاری پھڑ، میں آ رہا ہوں!!''

سن ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء، ۱۹۹۶ء، ۱۹۹۷ء کے سال تھے اور ستمبر، اکتوبر، نومبر کے مہینے۔۔۔ اِن پانچ سالوں کے اِن تین

مہینوں میں، میں مسلسل کئی سال اوپر، اوپر، بہت اوپر کے پہاڑ یاترا پر نکل جاتا۔۔ لہٰذا بیگ کندھوں پہ رکھے، گھر (خیمہ) اس بیگ کے اوپر اور "ان پانی" (زادِراہ، کھابے) اس بیگ کے اندر، اللہ اللہ تے خیر صلا۔۔۔

ہر سال ماحول ایک سا ہی رہتا، جانا بڑے شوق سے ہوتا، جوش غالب رہتا اور ہوش و مزے سے سویا رہتا اور واپس آنے پر اس نگوڑی ماری" ہائیکنگ" کی مصیبتوں سے تنگ آ کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس ہائیکنگ کو کھڑے کھڑے تین طلاق دے دیتا اور پھر کبھی بھی اس کو گھر میں داخل نہ کرنے کے اپنے دل سے پکے عہد کرتا۔۔۔ اور سارا سال پھر اس وعدے پہ قائم بھی رہتا۔۔۔ مگر عین جب فصل گل آتی، میرے اردگرد گھاس اونچی ہونے لگتی تو اس گھاس کے اندر ہی کہیں بغاوت کی بوٹی بھیا اونچی ہونے لگتی، میں چن چن کر اس بوٹی کو تلف کرتا، مگر اگلے روز جب اٹھتا ہوں تو یہ پہلے سے زیادہ ہوئی ہوتی۔

اپنے بچوں کو اس بوٹی کے سامنے کھڑا کر کے ان معصوموں کا واسطہ دے کر، ہاتھ جوڑ اس سے جان چھڑواتا ہوں مگر وہ کسی اکاس بیل مانند میری رگ رگ میں اترتی جاتی۔۔۔ میرے انگ انگ کو جکڑنے لگتی۔

یہ تین مہینے میں اپنے تئیں خود کو آفس میں زیادہ سے زیادہ مصروف کر لیتا، آفس کے بعد رات گئے تک دوستوں میں بیٹھا رہتا، اوپر اوپر سے زوردار قہقہے لگا کر دل کو سمجھاتا کہ میں اب باغی نہیں ہوں کہ بغاوت چھوڑ دی میں نے۔۔۔ سنو! اب میں جنگلوں پہاڑوں کا شیر نہیں رہا، میرے بچوں نے شیر کی ماسی "بھیگی بلی" بنا دیا ہے مجھے۔۔۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرف دیکھو اور میرے حال پہ رحم کھاؤ۔

وہ بغاوت کی بوٹی ہلکے سے مسکرا دیتی، میرے بچوں کے سر پہ پیار دیتی اور خاموشی سے غائب ہو جاتی۔۔۔ خاموش، خاموش، میں اُس کی اِس خاموشی سے اکثر چڑ جاتا مگر وہ دھیرے دھیرے میرے گرد گھیرا تنگ کرتی جاتی، مجھے جکڑتے جاتی۔۔۔ خاموشی سے۔۔۔ یوں آہستہ آہستہ یہ بغاوت کی بوٹی مجھ پر از سرِ نو مکمل طور پر قبضہ کر لیتی۔ میرے اردگرد آکٹوپس کی صورت جال بچھا دیتی اور میں بے بس، مجبور، لاچار ہو کر ہر مرتبہ کی طرح "توبہ" کا کاسہ توڑ دیتا۔۔۔ اور ہر سال کی طرح عہد کرتا ہوں کہ۔۔۔ اِس برس، صرف اس برس۔۔۔ آئندہ بغاوت نہ کروں گا۔۔۔ کوہلو کا بیل بن کر، آنکھوں پہ کھوپے چڑھا کر زندگی گزاروں گا۔۔۔ سکون اور آرام کی زندگی۔۔۔ نہ کوئی پنگا لوں گا اور شدید ترین کوشش کر کے ہزاروں مزید خواہشیں پال لوں گا کہ پھر میرا بھی ہر اک خواہش پہ دم نکلے۔۔۔ ہزاروں خواہشوں کے بوجھ کے نیچے یہ ایک خواہش تو دب ہی جائے گی، اور میری جان چھوٹ جائے گی۔

تو جناب عالی! میں بھی اب فیض آباد اڈہ راولپنڈی سے کرنل منور حسین صاحب کی رہائش گاہ پہ جا رہا ہوں کہ مجھ جیسے جنونیوں کی آج اُن کے گھر بیٹھک ہے، جہاں آج ممبران کا باہمی تعارف، سفری رُوٹ، ذاتی اور مشترکہ سامان کی لسٹیں اور بہت سے کچھ لے طے کرنے ہیں کہ ہم کے ٹو جا رہے ہیں، کوئی خالہ جی کے گھر نہیں کہ منہ اُٹھائے چل پڑیں۔۔۔ بہت کچھ سوچنا اور سمجھنا ہوگا تو پھر چلتے ہیں راولپنڈی میں کرنل منور حسین صاحب کے گھر۔۔۔

(جاری ہے)

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر "گوجرانوالہ" سے ہے چنانچہ اسی نسبت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ بقلم خود بھی عہد جوانی میں چھوٹے موٹے پہلوان رہ چکے ہیں۔ ایم اے اکنامکس، ایم اے اردو کر چکے ہیں۔ پیدا ہی کھلاڑی ہوئے ہیں۔ قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیمائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں "کے ٹو" بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے "گوندوگورولا گلیشیئر" سر کیا، تب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔ مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی قلمکار ہیں، تین عدد سفرنامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

مزاحیہ

لو لیٹر

ڈاکٹر عابد معز

ایک سہانی صبح میں چائے کی چسکیوں کے ساتھ اخبار پڑھتے ہوئے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ بیگم سامنے تپائی پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھیں۔ موسم گرما ختم ہوا چاہتا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے ملگجے بادلوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ ٹھنڈی اور خوشگوار مون سونی ہوائیں پودوں کو جھومنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ ماحول کا اثر تھا یا موقع ہاتھ آ گیا تھا، اچانک بیگم نے شکایت کی۔ ''آپ نے مجھے کبھی لو لیٹر نہیں لکھا۔''

مجھے بیگم سے اس قسم کی شکایت کی توقع نہ تھی۔ بیگم کو مجھ سے ہزار ہا گلے شکوے ہیں۔ میرے خیال میں یہ قدرتی بات ہے۔ بیوی کی ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر شوہر کا دم نکلتا ہے۔ خواہشوں کے ساتھ بیوی کو شوہر نامدار کی جان بھی عزیز ہوتی ہے۔ نتیجتاً وقت کے ساتھ بیوی کی خواہشیں اور ارمان شکایتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ بیگم کی خلافِ توقع شکایت پر یقین نہ آیا۔ میں نے استفسار کیا ''کون سا لیٹر؟''

''لو لیٹر'' بیگم نے لو پر زور دیتے ہوئے تفسیر کی ''لو لیٹر یعنی محبت نامہ، عشقیہ خط، پریم پتر۔''

عجیب و غریب بات پھر بھی پلے نہ پڑی تو میں ہکلایا ''یعنی

میں ۔۔۔آپ کو۔۔۔لو لیٹر۔۔۔''

بیگم نے تیوری چڑھائی، آنکھیں نکالیں اور ہاتھ میں موجود چاقو کو لہراتے ہوئے آواز اونچی کر کے بولیں ''اور کون لکھے گا۔ شادی ہوئے دس سال گذر چکے ہیں۔اس عرصہ میں کیا آپ نے مجھے کوئی لو لیٹر لکھا ہے؟''

میں بیگم کو سمجھانے لگا ''کبھی موقع نہ ملا کہ میں آپ کو لو لیٹر لکھتا۔ لو لیٹر کے لیے محبت کرنا اور عشق کی طوفانی اور وجدانی کیفیت سے گزر کر زمانے کی رسموں اور ریتوں سے بغاوت کرنا ضروری ہے۔ہم اس نعمت بلکہ زحمت سے محروم رہے۔ میں اور آپ نیک سیرت، صالح اور فرمانبردار نوجوان تھے۔ والدین نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے پسند کیا اور شادی کردی۔لو لیٹر لکھنے کا موقع ہی ہاتھ نہ آیا۔''

بیگم نے لو لیٹر نہ تحریر کرنے کے سبب کا الٹا نتیجہ اخذ کیا ''صاف لفظوں میں کہیے نا۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ بزرگوں نے شادی کی، سو نباہ رہا ہوں۔''

میں اپنا سر پیٹ لینا چاہا لیکن باز رہا۔کہیں بیگم اس فعل کا کوئی اور مطلب نہ نکالیں۔ میں نے صفائی پیش کی ''بیگم دس سال کے دوران ہزار مرتبہ اپنی اٹوٹ اور بے پناہ محبت کا یقین دلا چکا ہوں۔کئی مرتبہ ''پتی پرکشا'' سے گذر چکا ہوں۔۔۔''

''لیکن کبھی لکھا نہیں ہے۔دو چار پیار بھرے کلمات لکھ دیتے تو میں خوش ہو جاتی!''

''چلیے آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دیتا ہوں۔'' میں نے زچ ہوتے ہوئے کہا ''کاغذ اور قلم لائیے، حلفیہ لکھ دیتا ہوں یا وکیل بلائیے، وصیت لکھوا دیتا ہوں۔''

''آپ خواہ مخواہ ناراض ہونے لگے۔لوگ محبت میں صحرا کی خاک چھانتے ہیں۔ پہاڑ کھود کر نہر نکالتے ہیں۔شاندار عمارتیں اور مقبرے بنواتے ہیں۔میں نے ایسی کوئی بے جا خواہش کا اظہار تو نہیں کیا ہے۔صرف لو لیٹر کی فرمائش کی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آپ کو لو لیٹر لکھوں گا۔'' میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

''کب؟'' بیگم فوری پوچھ بیٹھیں۔

''موقع میسر آتے ہی۔''میں نے جواب دیا۔

''یعنی دفتر میں۔''بیگم نے اندازہ لگایا۔

''جی نہیں۔دفتر میں کام رہتا ہے۔''میں نے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے دفتر میں کتنا کام ہوتا ہے! اگر دفتر میں نہیں تو شام میں گھر پر۔'' بیگم نے تجویز رکھی۔

''نہیں، آپ سامنے ہوں گی تو کیا خاک لو لیٹر لکھا جائے گا۔'' میں نے بہانہ بنایا۔

''ٹھیک ہے میں بچوں کے ساتھ باہر گھومنے جاتی ہوں۔'' بیگم نے جواب دیا۔

''پہلی مرتبہ میں لو لیٹر لکھنے والا ہوں۔ دو چار گھنٹوں میں یہ نیک کام نہیں ہو پائے گا۔ مجھے زیادہ وقت چاہیے۔'' میں نے دوسرا بہانہ بنایا۔

''آخر کب آپ مجھے لو لیٹر لکھیں گے۔؟'' بیگم زچ ہوتے ہوئے بولیں۔

''جب جدائی کے سبب خط لکھنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ کہتے ہیں فاصلہ محبت کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔'' میں نے بتایا۔

بیگم آنکھیں چراتے ہوئے بولیں۔''میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔گرما کے بعد بارش کا موسم آیا۔پھر وہ بھی ختم ہوا۔سردی کا موسم آیا تو بچوں کے اسکول میں چھٹیاں ہوئیں۔ بیگم نے میکے جانے کا پروگرام بنایا۔ مجھے دفتر سے رخصت لینے سے منع کر دیا کہ بار بار چھٹی لینے سے سروس ریکارڈ خراب ہوگا۔ بیگم اور بچے خوشی خوشی سفر کی تیاری کرنے لگے۔بیگم مجھے ہدایات دینے لگیں کہ ان کی غیر موجودگی میں کیسے رہوں۔ چائے اور سینڈوچ بنانے کا طریقہ بتایا۔گھر کی چابیاں حوالے کرتے ہوئے بیگم نے کہا۔''اپنا خیال رکھیے اور خیر خیریت کی اطلاع پابندی سے دیتے رہیے گا۔''

''جی میں فون کر لیا کروں گا۔'' میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

''فون کرنے سے پیسے ضائع ہوں گے۔ خط لکھتے رہیے گا۔''
بیگم نے تاکید کی۔

خط لکھنے کی بات پر میں چونک کر بیگم کی جانب دیکھا تو انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیا۔ ''حضور اپنا وعدہ پورا کیجیے۔ آپ کو لو لیٹر لکھنا ہے۔''

میں نے گردن ہلا کر اور پلکیں جھکا کر وعدہ پورا کرنے کا اقرار کیا۔ بیگم اور بچے چلے گئے۔ تب مجھے لو لیٹر کی خاطر بیگم کی پلاننگ کا اندازہ ہوا۔

بیگم اور بچوں کے جانے کے بعد دو چار دن تو میں نے تنہائی کے مزے لوٹے۔ رات گئے تک مٹر گشتی کرتا رہا اور گھر آ کر چادر تان کر سو گیا۔ جلد ہی دل بھر گیا۔ خالی گھر عجیب سا لگنے لگا اور در و دیوار ڈرانے لگے۔ گھر والی سے گھر بنتا ہے اور گھر ہوتا بھی اسی کا ہے۔ مرد کے لیے سارا جہاں پڑا ہے۔ نیلی چھت کے نیچے محنت، مشقت اور دوڑ دھوپ کرتا اور ستانے کے لیے کسی مسافر کی طرح گھر کا رخ کرتا ہے۔ اب گھر والی کی مرضی، چاہے آرام کرنے دے یا آرام حرام کر دے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ لیکن یہ بات متفقہ طور پر شوہروں نے مان لی ہے کہ گھر والی کے بغیر گھر بے معنی ہے۔

تنہائی پریشان کرنے لگی اور اس پر لو لیٹر کا مطالبہ غضب ڈھانے لگا۔ میں نے کاغذ اور قلم لے کر لو لیٹر لکھنے کا ارادہ کیا۔ سوچتا رہا کہ خط کیوں کر شروع کروں۔ القاب کیا ہوں۔ کیا انھیں ہمدم، ہمراز، جانِ من لکھوں یا مختصراً ''سویٹ ہارٹ'' کہہ کر مخاطب کروں۔ انھیں ڈارلنگ لکھوں یا ''جان سے عزیز'' لکھ کر اپنی جان چھڑاؤں۔ دیر تک سر کھپاتا رہا۔ کچھ نہ سوجھا تو خط لکھنا ملتوی ٹھہرا۔

دوسری اور تیسری کوشش بھی ناکام رہی۔ سوائے تاریخ، دن اور وقت کے، ضبطِ تحریر میں کچھ نہ آیا۔ جب سوچ سوچ کر لکھنے میں ناکام رہا تو جھنجھلا کر قلم کو خیالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ لو لیٹر مکمل ہوا جو اس طرح تھا۔

''زبیدہ۔۔۔ امید ہے کہ آپ لوگ خیریت سے گھر پہنچ گئے ہوں گے۔ امی ابا کو دیکھ کر سفر کی تکلیف زائل ہو گئی ہو گی۔ اب دونوں کی صحت کیسی ہے؟ امی کی شکر اور ابا کا بلڈ پریشر قابو میں ہو گا۔ انہیں میرا سلام کہیے۔ بچے کیسے ہیں؟ انھیں سفر میں لطف آیا ہو گا۔ آپ کو تنگ تو نہیں کر رہے ہیں۔ ان سے کہیے کہ اپنی شرارتیں کم کریں ورنہ ابو ناراض ہوں گے۔ اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ گزر بسر ہو رہی ہے۔ آپ کے بنائے کھانوں سے فریج خالی ہو چکا ہے۔ کل سے نکڑ والے ہوٹل سے دانہ پانی مقرر کر لیا ہے۔ دعا کیجیے کہ صحت قائم رہے۔ برتن دھونے کی کوشش میں چند برتن پھوڑ ڈالے۔ گھر کی صفائی کرنی شروع کی تو گل دان اور ٹیبل لیمپ توڑ ڈالے۔ اب برتن صاف کرتا ہوں اور نہ گھر میں جھاڑو پونچھا لگاتا ہوں۔ جھوٹے برتنوں کا انبار لگ چکا ہے اور گھر کباڑ خانہ لگنے لگا ہے۔ کپڑے میلے ہوئے تو لانڈری سے دھلوا لیے ہیں۔ بچوں کے اسکول کی فیس ادا کر دی گئی ہے۔ بجلی اور پانی کا بل بھی بھر دیا گیا ہے۔ دودھ والا اور ترکاری والی دو تین دن میں آ کر پوچھ جاتے ہیں کہ آپ کب آ رہی ہیں۔ ارادہ ہے کہ کسی ویک اینڈ پر آپ لوگوں کو واپس لینے آؤں۔ آپ کا کیا پروگرام ہے۔ کب آنے کا ارادہ ہے مطلع کریں تاکہ دفتر میں رخصت کی درخواست دے سکوں۔ حسب مراتب سلام، دعا اور پیار مرسل ہے۔ والسلام۔۔۔ فقط۔۔۔''

خط پوسٹ کر کے اطمینان اور چین کا سانس لینے بھی نہ پایا تھا کہ بیگم کا جواب موصول ہوا ''آپ کے خط نے مایوس کیا۔ افسوس کہ وعدہ ایفا نہ ہوا۔ آپ نے جو کارنامے انجام دیئے، وہ خلاف توقع نہیں ہیں۔ میری واپسی کے پروگرام کا انحصار آپ پر ہے۔ اپنا وعدہ پورا کیجیے تب ہی ہمیں لینے آئیے گا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ امی، ابا اور بچے خیریت سے ہیں۔۔۔ خدا حافظ۔''

مختصر تحریر سے بیگم کی برہمی اور ناراضگی کا اندازہ ہوا۔ وہ سامنے ہوتیں تو میں انھیں کسی طرح سمجھا اور منا لیتا کہ شادی کے بعد لو لیٹر کی جگہ شوہر روزنامچہ لکھتا ہے۔ بیوی آٹے دال کا بھاؤ اور گرانی کا رونا روتی ہے۔ اشاروں اور کنایوں میں کچھ باتیں بین السطور کہہ دینا الگ بات ہے لیکن علی الاعلان ''آئی لو یو'' کہنا ممکن

نہیں ہے۔ مشکل یہ تھی کہ بیگم سامنے نہیں تھیں اور لو لیٹر کے بغیر واپس آنے کے لیے تیار بھی نہیں تھیں۔ بیگم کو راضی کرنے اور انھیں واپس بلانے کے لیے لو لیٹر لکھنا اب ضروری ہو گیا تھا۔

پہلی کوشش ناکام ہونے کے بعد میں سنجیدگی سے لو لیٹر اور اس کی ہیئت ترکیبی پر غور کرنے لگا کہ لو لیٹر کیا ہوتا ہے؟ کیسے اور کیوں کر لکھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لو لیٹر محبت کا تحریری اظہار ہے۔ دل میں خیال آیا کہ اگر مجھ جیسے عاشق کو جسے عام خط لکھنے کا بھی سلیقہ نہ آتا ہو تو وہ کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ دوسروں کی مدد لینی چاہیے۔

میں نے اپنے دوست راشد سے مشورہ کیا۔ اس نے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا ''کیوں میاں کس سے عشق لڑا رہے ہو؟''

''تمہاری بھابی سے!'' میں نے جواب دیا۔

''میں نہیں مانتا۔ بیوی کو کون لو لیٹر لکھتا ہے۔ سچ بتاؤ۔'' راشد نے جرح کی۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ''میری ایسی قسمت کہاں۔ تمہاری بھابی نے لو لیٹر کی فرمائش کی ہے۔ کبھی لو لیٹر لکھا نہیں ہے، شاید تمھیں تجربہ ہو۔''

راشد کو یقین نہ آیا ''شادی کے بعد لو لیٹر کی ضرورت رہتی ہے اور نہ اہمیت، مجھے نہ بناؤ۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں 'انجمن حقوقِ زوجگاں' کا صدر ہوں۔ بھابی پر ظلم نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے تمہارے ساتھ زیادتی کیوں نہ ہو جائے۔''

''تم مجھے اپنی انجمن کا نائب صدر سمجھو اور خاطر جمع رکھو۔ مجھے اپنی بیوی کو لو لیٹر لکھنا ہے۔'' میں نے صفائی میں کہا۔

''سر دست میں یقین کر لیتا ہوں۔ اس لیے کہ بعض اوقات بیگمات عجیب و غریب فرمائشیں کرتی ہیں۔ پچھلے ہفتہ، میں اور تمہاری بھابی چہل قدمی کرنے پارک میں گئے تھے جہاں اور بھی لوگ تھے۔ ایسے ماحول میں انھوں نے مجھ سے ایک گیت گانے کی فرمائش کی، وہ بھی اونچی آواز میں!'' راشد نے بتایا۔

''پھر؟'' میں نے راشد کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''پھر کیا۔ مجھے گانا پڑا۔'' راشد نے جھینپتے ہوئے بتایا۔

''اب بے تکی فرمائش کرنے کی باری میری بیگم کی ہے۔ چلو میری مدد کرو۔'' میں نے راشد سے کہا۔

ہم نے سر جوڑ کر لو لیٹر پلان کیا۔ محبوبہ کے حسن، نزاکت اور اداؤں کی تعریف کے بعد محبت کا بار بار اقرار ہوگا۔ محبت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کے مردانہ وار مقابلے کا اعلان اور آخر میں وصل کی خواہش کا اظہار ہوگا۔ خط لکھنے کے لیے اشعار کی مدد لی جائے گی، سو ہم نے چند دیوان کھنگالے۔ ایسے ایسے اشعار ہاتھ لگے کہ عقل دنگ رہ گئی۔ بہت لطف آیا۔ بعض اشعار پر ہمیں لطیفوں کا گمان گزرا۔ مجموعی؟ کلام کھنگالنے اور چند اشعار نوٹ کرنے کے بعد ہم نے نثر نگاری کے لیے افسانوی ادب کا رخ کیا۔ یہاں بھی ہمیں مایوسی نہیں ہوئی۔ دو ایک مرتبہ معشوق کی لفظی خوب صورتی پر راشد دل و جان سے فدا بھی ہوئے۔ رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے ہم نے فلمیں دیکھیں۔ دورِ حاضر کی فلموں میں محبت کا یوں عملی اظہار ہونے لگا ہے کہ ہم اپنی آنکھیں بند کر لینے پر مجبور ہوئے۔ پرانی فلمیں پسند آئیں۔ 'آپ کے خوب صورت پاؤں دیکھے۔ انھیں زمین پر نہ رکھیے' جیسا اظہار محبت کا انوکھا طریقہ دریافت ہوا۔

قصہ مختصر، عرق ریزی اور دماغ پاشی کے بعد ہم نے لو لیٹر کا مسودہ تیار کیا۔ لیٹر پیڈ کے لیے بازار کا رخ کیا اور ایک معطر اور رومان پرور پیڈ خریدا، جس کے ایک کونے پر دل میں تیر پیوست تھا تو دوسرے پر 'پریم پرندے' (BirdsLove) چونچ ملا رہے تھے۔ احتیاط اور سنبھل سنبھل کر راشد کی مدد سے میں نے لو لیٹر سپرد قلم کیا

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

سلامِ محبت!

تم سے بچھڑے کچھ ہی عرصہ گزرا ہے لیکن محسوس ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی پر بھاری لگتا ہے۔

تم سے بچھڑے تو سمجھ میں آیا
لوگ مر کر بھی جیا کرتے ہیں

نہ دن کو چین ہے اور نہ ہی رات کو آرام۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ آفس برائے نام جاتا ہوں۔ نہ کھانے میں لطف آتا ہے اور نہ بھوک محسوس ہوتی ہے۔ جب تمھاری یاد کی شدت بڑھ جاتی ہے اور جدائی کا احساس تڑپانے لگتا ہے تو میں بے مقصد سڑکوں پر گھومتا پھرتا ہوں۔ تھک ہار کر گھر لوٹ آتا ہوں تو تنہائی ڈسنے لگتی ہے۔ فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھا آسمان کو تکتا رہتا ہوں۔ چاند میں، تاروں اور ستاروں میں، ثریا اور کہکشاں میں، جدھر نظر جاتی ہے، تمھارا چہرہ نظر آتا ہے۔

آنکھیں بند کرتا ہوں تو تمھاری تصویر ابھر آتی ہے اور تمھارے ہاتھوں کا لمس اپنے شانوں پر محسوس کرتا ہوں۔ چونک کر آنکھیں کھولتا ہوں تو تمھیں اپنے سامنے پاتا ہوں۔ غضب ڈھاتی گیسوؤں کی گھٹائیں۔ نرگسی آنکھیں جن کی جھیل سی گہرائیوں میں ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ چودھویں کے چاند سا روشن چہرہ، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے نرم و نازک لبوں کی اوٹ سے چمکتے اور دمکتے موتیوں جیسے دانت، ستواں ناک، صراحی دار گردن، مخروطی انگلیاں، صندلی بانہیں، سرو قد، سبک و خراماں چال، مجسم شوخی و شباب اور جب تم مسکراتی ہو تو تمھارے داہنے گال میں جو خفیف سا گڑھا پیدا ہوتا ہے وہ تمھارے حسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

آسماں کے چاند تارے خوب صورت ہیں مگر
دلکشی تیری مگر اے روئے جاناں اور ہے

میں بات کرنے اور چھونے تمھاری جانب بڑھتا ہوں تو دیوار سے ٹکرا کر جدائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔

تمھارے چہرے پر مایوسی اور ناامیدی چھائی ہے۔ بال پریشاں حال، اڑی رنگت، آنکھیں بھر آئی ہوئیں اور تھرتھراتے لب۔ تم سے جدائی کا بوجھ اٹھائے نہیں اٹھتا۔ میری جان اداس نہ رہنا، پریشان ہو کر ہلکان نہ ہونا، انتظار کرنا۔ صرف چند دن انتظار۔ میں راہ میں بچھے کانٹوں کو چن لوں گا، ہر مشکل کو دور کر دوں گا۔ ہماری راہ میں رکاوٹیں حائل ہیں تو کیا ہوا۔ ہم محبت

بعض لوگ تکنیکی معلومات کی نوعیت کو کماحقہ نہیں جانتے اور اسے بیان کرنے میں دلچسپ ترمیم کر ڈالتے ہیں جو سننے پڑھنے والوں کے لئے تفنن طبع کا سبب بنتی ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب یہ کہتے ہوئے پائے گئے ''سنا ہے اب تک لاہور میں ۲۵۰ کلومیٹر بارش ہو چکی ہے۔''
ڈاکٹر عزیز فیصل

کرنے والے کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ انتظار شرط ہے۔ تمھیں نے ایک مرتبہ صنوبر کے درخت کی چھاؤں میں میرے ہاتھوں پر اپنے قیمتی آنسو ٹپکا کر کہا تھا کہ انتظار محبت ہے اور محبت انتظار ہے۔

ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے

میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، میری جانِ عزیز کہ میں تمھیں بے حد چاہتا ہوں۔ دل و جاں سے تم پر مرتا ہوں۔ کائنات میں اگر کوئی شے مجھے محبوب ہے تو وہ تم اور صرف تم ہو۔ بس میرا انتظار کرنا۔۔۔''

تمھارا اور صرف تمھارا دیوانہ۔

لکھنے کے بعد میں نے لو لیٹر پڑھا تو خود مجھے ہنسی آئی اور خط پوسٹ کرنے میں تکلف ہونے لگا۔ شرم بھی آئی کہ ہم نے کیا اوٹ پٹانگ بکواس کی ہے۔ بیگم کو بلانے کے لیے لو لیٹر پوسٹ کرنا تھا لیکن خط پڑھ کر میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ آخر میں نے لو لیٹر کو اٹھا کر الماری میں محفوظ کر دیا کہ دو دن بعد سوچ سمجھ کر ڈاک کے حوالے کروں گا۔

شام میں اچانک بیگم، بچوں سمیت واپس آ گئیں۔ میں حیران اور خوش ہوا ''آپ اچانک کیسے!''

''کیا میں اپنے گھر نہیں آ سکتی؟'' بیگم نے الٹا سوال کیا۔

''گھر آپ کا، گھر میں جو ہے سو آپ کا، بلکہ میں بھی مکمل آپ ہی کا لیکن آپ لو لیٹر کے بغیر کیسے آ گئیں؟''

بیگم نے بات کاٹی ''چند دن گھر سے دور رہی تو اپنی نادانی کا احساس ہوا۔ میں نے بے جا آپ سے لو لیٹر کی فرمائش کی ہے۔ ندامت بھی ہوئی۔''

''لیکن میں نے لو لیٹر۔۔۔'' میں اپنی کارکردگی بتانا چاہا لیکن

بیگم نے میرا جملہ مکمل ہونے نہ دیا۔
''خدارا۔ اس موئے لو لیٹر کا نام نہ لیجیے۔ اپنی بے وقوفی کے ذکر پر تکلیف ہوتی ہے۔'' بیگم نے وضاحت پیش کی۔
میں خوشی سے اچھل پڑا ''کچے دھاگے میں بندھی چلی آئیں سرکار۔ یہی میری محبت ہے۔''' اور پھر میں نے جھجکتے ہوئے کہا ''آئی لو یو، پپو کی ممی!''
بیگم نے شرما کر نظریں نیچی کرلیں۔
دو چار دن آرام سے گزرے۔ بیگم نے ضرورت سے زیادہ میرا خیال رکھا، خوب کھلایا پلایا کہ ان کی غیر موجودگی میں میری صحت متاثر ہوئی ہے۔ بغیر لو لیٹر انھیں میری چاہت کا یقین ہو چلا تھا۔
لیکن ایک شام جب میں دفتر سے گھر آیا تو بیگم کو غصّے میں ٹہلتا ہوا پایا۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑیں ''مل آئے اپنی جانِ آرزو سے! پڑ گئی کلیجے میں چودھویں چاند کی ٹھنڈک؟''
میں حیران ہوا ''یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں کس سے مل آیا۔''
''اسی جل ککڑی سے جو میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔ جس کی وجہ سے جناب کو دن میں چین ہے اور نہ رات کو آرام ملتا ہے۔ کھانے میں لطف آتا ہے نہ بھوک لگتی ہے۔ جس کی دلکشی کے آگے چاند تارے بھی ماند پڑتے ہیں اور جس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں جناب کا ڈوب جانے کو دل چاہتا ہے۔ ارے میں تو کہتی ہوں، ڈوب مرو کسی اصلی جھیل یا تالاب میں یا پھر مجھے ہی جھونک آؤ۔''
میں ہکلایا ''میں سمجھا نہیں۔''
''نا سمجھ تو میں ہوں۔ کیسے بھولے بنتے ہیں۔ میرے لیے چار حرف لکھے نہیں گئے۔ کبھی بھولے سے ایک مصرع بھی نہ کہا۔ اس کے لیے صفحوں کے صفحے کالے ہو رہے ہیں۔ شاعری ہو رہی ہے۔ اس کی صورت چاند ستاروں اور کہکشاں میں نظر آرہی ہے۔ جدائی پریشان کرتی ہے۔ وہ آپ کا اور آپ اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ کیوں کہ انتظار محبت ہے۔ مزید انتظار نہ کیجیے۔ دبا دیجیے میرا گلا اور بچوں کو زہر پلا دیجیے۔ ہم سب سے چھٹکارا مل جائے گا۔

محبت کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ پھر لے آیئے اس حرافہ کو۔'' بیگم باقاعدہ رونے لگیں۔
میں کچھ دیر ہنستا رہا اور پھر معاملہ کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی ''بیگم وہ لو لیٹر میں نے تمھارے لیے اور تمھارے ہی کہنے پر لکھا تھا۔ میری قسم۔۔۔ تمھاری قسم۔۔۔ اپنے بچوں کی قسم۔۔۔''
یقین نہ کرتے ہوئے بیگم نے سوال کیا ''بتلایئے! کیا میرا قد ''سرو'' جیسا ہے؟' (بیگم کا قد درمیانے سے کچھ کم ہے)'' کیا میرے بال گھٹاؤں کی طرح ہیں؟'' (بیگم پابندی سے گیسوتر شواتی ہیں)'' اور میری طرف غور سے دیکھ کر بتایئے کہ مسکرانے پر کون سے گال میں گڑھا پڑتا ہے؟ کس پیڑ کے نیچے، کب اور کہاں میں نے آپ کے ہاتھوں پر آنسو ٹپکائے ہیں؟ ہائے میری قسمت پھوٹ گئی۔'' بیگم کا رونا جاری رہا۔
مشترکہ کوششوں سے ہم لو لیٹر لکھ تو گئے، اب اندازہ ہوا کہ ہم نے کیا کیا آئیں بائیں شائیں اور جھوٹ موٹ لکھ ڈالا۔ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں سر لیے سوچنے لگا کہ اس غلطی کا علاج کیوں کر ہو۔
ابھی میں نے راشد کو فون کیا ہے کہ وہ فوراً آئے اور گواہی دے کہ میں نے یہ لو لیٹر اپنی بیگم کو لکھا ہے، صرف اپنی منکوحہ بیگم ہی کو اور اپنی بیگم کے علاوہ کسی اور کو نہیں! اور یہ لو لیٹر لکھنے میں اس نے میری مدد کی ہے۔

عابد معز صاحب کا تعلق حیدر آباد (بھارت) سے ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ اُردو ادب سے اِن کی محبت بہت پرانی ہے۔ طنز و مزاح اِن کا خصوصی میدان ہے۔ اُردو طنز و مزاح سے حوالے سے اِن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدر آباد کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ ''شگوفہ'' کے علاوہ بہت سے ادبی و غیر ادبی جرائد میں اِن کے مزاحیہ مضامین تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بہت نفیس طبعت کے مالک ہیں۔

م۔ص۔ایمن

الو کا پٹھا

تھوڑا سا پس منظر بتادوں تا کہ یہ مضمون سمجھنے میں آسانی ہو جائے ۔ ۱۹۷۶ء میں والد صاحب نے مجھے پاکستان آرمی میں درزی کی حیثیت سے بھرتی کروادیا۔ ابا چاہتے تھے کہ میں درزی کا کام کروں لیکن میری مرضی یہ نہ تھی ۱۹۸۲ء میں ابا ریٹائر ہوگئے تو میں نے اپنا تبادلہ کارپینٹر شاپ میں کروالیا۔

جمعہ کے دن چھٹی ہوتی اور میں سارا دن نکما ہوتا۔ وقت ضائع کرنے کی بجائے میں نے قریبی جمعہ بچت بازار میں برتنوں کا سٹال لگانا شروع کیا۔ تین سو روپے سے بزنس شروع کیا۔ الحمدللہ! برکت ہوئی ۔ مال بڑھا تو گھر میں رکھنے کا مسئلہ پیدا ہوا، ایک دکان کرائے پر لینا پڑگئی ۔ اول اول اس دکان کو گودام کے طور پر استعمال کیا اور پھر لائبریری بنالی جواب بھی الحمدللہ موجود ہے ۔

بازار میں بھی برتنوں کی بجائے کتابیں بیچنا شروع کردیں ۔ اب میں بیک وقت تین تین کام کررہا تھا یعنی صبح ملازمت کارپینٹر کا کام، شام کو لائبریرین اور جمعہ کے دن جمعہ بازار میں کتب فروشی ۔ دکان لب سڑک واقع ہے، دائیں بائیں ڈینٹنگ پینٹنگ کی دکانیں ہیں جن کی گاڑیاں سڑک پر ہی کھڑی رہتی ہیں۔ ہمارا مال ایک سوزوکی پک اپ پر جایا کرتا تھا۔ فجر کے وقت گاڑی آتی اور ہمارا سامان لے جاتی۔ اسلم غوری کی سوزوکی پر میرے مال کے ساتھ نور محمد نامی شخص کا ۔ وہ ہفتے میں چار دن بازاروں میں برتن کا سٹال لگاتا تھا۔ جمعہ کے دن اسی گاڑی پر میری کتابوں کے ساتھ اس کا سامان بھی ہوتا۔ اس کا گھر راستے میں تھا ۔ گاڑی پر پہلے میرا سامان رکھا جاتا اور پھر اس کا۔ وہ اپنے سامان کے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاتا جبکہ میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھتا اور اس کا بیٹا ناصر میرے ساتھ ہی بیٹھ جاتا۔

ایک بار اسی طرح ہم بازار کی طرف جا رہے تھے ، ناصر میرے ساتھ ہی سوزوکی میں بیٹھا تھا کہ ناصر نے سوال کیا ”ایمن بھائی ! آپ کسی اور بازار میں نہیں جاتے ۔۔ صرف جمعہ بازار میں ہی جاتے ہیں۔ کیوں؟“ میں چپ رہا، اسے کیا جواب دیتا ؟۔ اس نے پھر پوچھا ”کیا دکان میں آپ کو زیادہ فائدہ ہوتا ہے کہ آپ صرف جمعہ بازار ہی جاتے ہیں دوسرا بازار نہیں لگاتے۔“

میں پھر چپ ہی رہا تو اسلم غوری بولے ”ایمن صاحب باقی دنوں میں دوسرا کام کرتے ہیں اس لیے بازار نہیں لگاتے۔“

”دوسرا کیا کام کرتے ہیں“

اسلم غوری نے بتایا ”یہ کارپینٹر ہیں“

ناصر نے پوچھا ''کون سے گیرج میں''

''کیا؟'' ہم دونوں حیران ہوگئے۔۔

وہ بولا ''کون سے گیرج میں کاروں کو پینٹ کرتے ہیں''

اس کی بات سمجھ کر ہم ہنس پڑے اور بے تحاشہ ہنسے، اتنا بھی ہنسے کے کہ بازار پہنچنے تک ہم دونوں ہنستے ہی رہے اور بار بار ہنستے رہے۔ دو افراد کی جگہ ہم تین پھنس کر بیٹھے ہوئے تھے۔ یوں مجھے ہنسنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی، پسلیوں میں درد ہونے لگا تھا۔

بازار پہنچے۔ ہم نے اترتے ہی نور محمد کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''یار نور محمد! اگر تم اپنے بیٹے کو دو چار جماعتیں پڑھوا دیتے تو ہمیں آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا!''

نور محمد پریشان ہوگیا، بولا ''کیوں بھئی! کیا ہوگیا۔''

اسلم غوری نے اسے راستے کی روداد سنائی کہ تمہارے بیٹے نے پوچھا کہ 'ایمن بھائی باقی دنوں میں بازار کیوں نہیں لگاتے' میں نے بتایا کہ ایمن بھائی باقی دنوں میں کارپینٹر کا کام کرتے ہیں تو یہ پوچھتا ہے ''کون سے گیرج میں''۔ یہ کہہ کر غوری نے پھر ہنسنا شروع کردیا۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ نور محمد نے ہماری شکایت کا فوراً نوٹس لیا۔ اپنے پیارے بیٹے ناصر کو پیار سے ڈانٹا ''بیٹے! ایمن بھائی کو کسی گیرج کی کیا ضرورت ہے؟ اتنا بڑا روڈ ان کے سامنے ہے۔ لائن سے گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں۔ وہیں روڈ پر ہی ڈینٹر ڈینٹ نکالتے ہیں۔۔۔ یہ کاروں کو پینٹ کرتے رہتے ہیں۔''

اب تو ہنس ہنس کر ہمارا برا حال ہوگیا۔ ہمیں ہنستے دیکھ کر دیگر سٹال والے بھی قریب آئے اور جب انہیں وجہ معلوم ہوئی تو وہ بھی ہنسنے لگے۔

پھر میں نے کہا ''دراصل قصور نور محمد کا یا اس کے بیٹے ناصر کا نہیں ہے یہ انگریز کا قصور ہے کہ لکڑی کا کام کرنے والے کو وہ کارپینٹر کہتا ہی کیوں ہے؟ جبکہ نہ تو اس کا تعلق کار سے ہے نہ پینٹ سے۔''

بات چل نکلی ہے کارپینٹری کی۔ تو ایک بات اور نکل آئی۔

جب میں کارپینٹر شاپ گیا تو وہاں چوبیس افراد تھے جن میں دو لیبر تھے اور بائیس کارپینٹر۔ ان بائیس میں سے صرف تین ہی کارپینٹر تھے باقی ''ایویں ای'' تھے۔ میں نے ان تینوں کو اس پر مائل کیا کہ وہ ان سب کو کام سکھائیں اور دیگر سے کہا کہ وہ کسی نہ کسی کو استاد سمجھ کر اس کے ساتھ ساتھ رہا کریں تا کہ انہیں بھی کام آئے۔ کم از کم اپنے گھر کا کام تو خود کرسکیں۔ یوں الحمدللہ! تھوڑے ہی عرصے میں سب بہترین کارپینٹر ہوگئے۔ میں اسے اپنا بہترین کارنامہ قرار دیتا ہوں۔

ہمارا ایک شاگرد تھا۔ عبدالرحمٰن نام تھا اس کا۔ اسے ہم نے عارف نامی ایک کارپینٹر کے حوالے کیا کہ وہ اس کا استاد ہے اور یہ اس کا شاگرد۔

عارف نے استادی کا ''حق'' ادا کردیا۔ سارے کام عبدالرحمٰن سے کرواتا۔ عبدالرحمٰن بھی سعادت مندی سے اس کے

کچھ چیزوں کے ساتھ کچھ چیزیں ضرور آتی ہیں۔ مثلاً بھینسوں کے ساتھ جوہڑ آتا ہے۔ پاتھیاں آتی ہیں اور وڑینویں (بنولا) آتے ہیں۔ مونچھوں کے ساتھ قینچی آتی ہے اور ''مساوات'' قائم کرتے کرتے قینچی باقی رہ جاتی ہے۔ مونچھیں صاف ہو جاتی ہیں۔ ہم یہ سب تجربے کر بیٹھے ہیں۔ بچپن میں گھر والوں نے ایک بھینس پالی تھی۔ جس کی نگرانی کا کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ جوہڑ پاتھیوں اور وڑینوؤں سے تنگ آ کر ایک دن ہم نے الٹی میٹم دے دیا اور کہا ''اس گھر میں ہم رہیں گے یا یہ بھینس رہے گی'' یہ سن کر گھر والوں نے دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے غور و خوض کیا اور پھر فرمایا ''بھینس رہے گی'' خود ہمیں اس فیصلے میں خاصی معقولیت دکھائی دی۔ کیونکہ ہم دودھ نہیں دیتے تھے۔ گوجروں (اور اہلیان گوجرانوالہ) کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ صورت حال ابھی تک جوں کی توں ہے۔ کسی زمانے میں ہم نے مونچھیں بھی رکھی تھیں اور ان مونچھوں کے ساتھ قینچی بھی گھر میں چلی آئی۔ مگر ''مساوات'' کے چکر میں پڑ کر یہاں بھی مونچھوں ہی کو گھر نکالا دینا پڑا۔ اب ہمارے پاس مونچھیں ہیں اور نہ قینچی ہے۔ دنیا کے بے ثباتی پر رونا آتا ہے۔

سارے احکامات بجالاتا۔ دونوں صبح سے شام تک ساتھ ساتھ پائے جاتے۔حتیٰ کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا شروع ہوگیا۔ پکی دوستی ہوگئی۔

لگاتار تین چھٹیاں آرہی تھیں۔ کچھ ساتھیوں کا تفریح کا پروگرام بن گیا کہ یہ چھٹیاں شہر سے باہر گزاریں گے۔ جمعہ بازار کی وجہ سے میں نہ جاسکا۔

حسب پروگرام سب گئے۔ واپس آئے تو معلوم ہوا استاد شاگرد کی ان بن ہوگئی ہے۔سب لوگ شاگرد کا مذاق اڑاتے رہے۔ادھر شاگرد خاموش خاموش رہنے لگا تھا۔عارف استاد سے قطع تعلق کرلیا۔اس کے ذکر سے بھی چڑنے لگا۔اس موضوع پر کوئی بات کرتا تو اس سے بھی ناراض ہوجاتا کہ تم مذاق اڑاتے ہو۔ پھر وہ میرے قریب رہنے لگا۔

ایک دن مجھے موقع ملا۔میں نے پوچھ لیا کہ ''ہوا کیا تھا؟''

بولا ''ہونا کیا تھا استاد! جب ہم جارہے تھے تو استاد نے بولا ''میں گھر سے اپنا بستر لے آؤں۔۔۔یا تم دو لے آؤ گے؟'' میں نے کہا ''استاد! میں دو لے آؤں گا۔تم نہیں لانا'' استاد نے پوچھا ''کھانا میں لاؤں یا تم لے آؤ گے دو افراد کے لیے'' میں نے کہا ''نہیں استاد تم کچھ نہ لانا۔۔میں لے آؤں گا۔گل بائی کی نہاری مشہور ہے لین لگی رہتی ہے، میں وہاں سے لے آؤں گا ساتھ روٹیاں بھی۔'' پھر یہ ہوا کہ میں روٹیاں بھی لے گیا۔برتن بھی اور بستر بھی دو لے گیا۔استاد خالی ہاتھ آیا۔اس کا سارا خرچہ میں نے کیا۔ہم جب ادھر پہاڑوں پر گئے۔دوپہر کا ٹائم ہوا۔سب کھانا کھانے بیٹھے تو استاد بولا۔''ابھی ہم سب کے ساتھ کھائیں گے تو یہ لوگ بھی ہماری نہاری کھاجائیں گے۔۔ہم ایسا کرتے ہیں ان کو کھانے دے۔ہم بعد میں کھالیں گے'' میں نے بولا ''ٹھیک ہے استاد! جیسے تم بولو۔'' تو استاد!۔۔۔سب لوگ کھانا کھانے بیٹھے۔ہم کو انہوں نے بلایا تو استاد بولا 'تم لوگ کھاؤ'۔ہم نے ابھی سموسے کھائے ہیں، ابھی بھوک نہیں ہے، ہم نماز پڑھ کر کھائیں گے''۔۔اس طرح سب نے کھانا کھالیا۔استاد نے نماز پڑھی۔تین بج گئے۔ہم کھانا کھانے بیٹھے تو صبح سے بند پڑی ہوئی نہاری نے بدبو چھوڑ دی۔اب ہم کیا کریں؟ باقی لوگوں نے پہلے کھانا کھالیا تھا۔نہیں تو ہم ان کے ساتھ مل کے کھاتے تو بلے نہاری خراب بھی ہوتی۔۔۔ہم کچھ نہ کچھ تو کھالیتے۔اب استاد بولتا ہے تم خراب نہاری لے کر آئے ہو۔تم ہی بولو استاد! غلطی میری اے کہ استاد کی؟''

میں نے کہا ''یہ تو غلطی تیرے استاد کی لگتی ہے۔۔۔سب کے ساتھ کھانا کھانے سے یہ فائدہ تھا کہ ہوسکتا ہے اس وقت تک نہاری خراب نہ ہوئی ہوتی!''

بولا ''یہ بات بھی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ رات کو جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو میرے بستر کو استاد بولتا ہے اس میں کھٹمل بہت ہیں۔ ہم نے بستر بدلی کیا تو بولا اس میں بھی کھٹمل ہیں۔اب استاد! کھٹمل تو سب کے گھر میں ہوتے ہیں لیکن استاد نے صبح میری بہت بے عزتی کی سب کو بتادیا۔بولا ''ایک تو کل خراب نہاری لے کے آیا میرے کو بھوکا ماردیا اور رات کو میں تیرے کھٹمل مارتا رہا ہوں۔۔ذرا بھی نہیں سوسکا۔'' بس استاد نے سب کے سامنے میری بے عزتی کی اور سب نے میرا ریکارڈ لگادیا۔میرے کو غصہ آگیا کہ وہ خود بلے بولتا جو مرضی ہے۔ لیکن دوسروں کے سامنے تو بات نہیں کرتا نی۔بس اب اس کے ساتھ کٹ ہے۔''

کچھ دن تو معاملہ گرم رہا۔ساتھی عبدالرحمٰن کو چھیڑتے رہے۔

ایک دفعہ ایک آدمی نیویارک کے مرکزی پارک میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک اس نے ایک کتے کو ایک چھوٹی بچی پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا۔۔وہ اس کی طرف دوڑا اور کتے کو مارنے لگا۔کتے کو مار کر بچی کو مارنے میں کامیاب ہوگیا۔ایک پولیس والا جو یہ سب واقعہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا' اس کے پاس آیا اور بولا ''''تم ایک ہیرو ہو،کل تم سارے اخباروں میں یہ پڑھو گے ایک بہادر نیویارکر نے ایک چھوٹی سے بچی کی جان بچائی۔''

''مگر میں نیویارکر نہیں ہوں'' آدمی نے جواب دیا۔

''اوہ پھر پڑھو گے، ایک بہادر امریکن نے ایک چھوٹی سی بچی کی جان بچائی۔۔۔''

''مگر میں امریکن نہیں پاکستانی ہوں۔''

اگلے دن اخبار میں لکھا تھا ''ایک اسلامی تشدد پسند نے ایک امریکی کتے کو مار ڈالا،ممکن ہے کہ دہشت گردوں کے کسی گروپ کے ساتھ اس کا تعلق ہو۔''

اس کے بعد معاملہ دھیما پڑ تا گیا۔ بالکل ہی ختم نہیں ہوا۔

ایک دن عبدالرحمٰن میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔کوئی غلطی کر گیا تو میں نے اسے ڈانٹا اور غصے میں ''الو کا پٹھا'' کہہ دیا۔ وہ بگڑ گیا بولا۔'' میرے کو گالی نہیں دینا۔۔ میں گالی کا مذاق بھی نہیں کرتا ہوں نی۔''

میں نے کہا'' تو ہے ہی الو کا پٹھا! تو تیرے کو الو کا پٹھا نہیں بولوں؟''

بولا'' میں پھر بولتا اوں نی!۔۔میرے کو گالی مالی نہیں دیو۔''

میں نے کہا''تمہیں کس نے کہا ہے،الو کا پٹھا گالی ہے؟۔''

'' میرے کو معلوم ہے، یہ گالی اے۔''

میں نے کہا'' یہی تو تجھے پتہ نہیں ہے۔الو کا پٹھا گالی نہیں ہے۔کون کہتا ہے یہ گالی ہے۔تو مجھے بول الو کا پٹھا۔ میں برا نہیں مانوں گا''۔

وہ بولا'' نہ میں کسی کو گالی دیتا ہوں نہ کسی سے سنتا ہوں۔''

میں ہنسا '' اوہ یار! کسی کو الو کا پٹھا بولنا گالی نہیں ہے۔۔اچھا تو مجھے بتا۔۔۔میرا استاد کون ہے یہاں؟''

بولا۔'' تمہارا استاد کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔تم تو درزی کا کام کرتے کرتے کارپینٹر شاپ میں آگئے اور کارپینٹر بن گئے۔ تمہارا استاد تو ادھر کوئی بھی نہیں ہے۔''

میں نے پوچھا''نہیں ہے نا؟''

بولا''نہیں ہے!''

میں نے کہا'' اسی لیے تو کہتا ہوں۔اگر کوئی مجھے الو کا پٹھا دس بار بھی بولے تو میں ناراض نہیں ہوتا۔ کیونکہ میرا تو استاد ہی کوئی نہیں ہے۔''

بولا''میں تمہاری بات نہیں سمجھا ہوں نی۔''

میں نے کہا'' بات سن۔۔۔دیکھو ایک کلاس میں تیس لڑکے پڑھتے ہیں۔استاد سب کو ایک جیسا پڑھاتا ہے۔۔ جب امتحان ہوتا ہے تو سب پاس ہو جاتے ہیں ان میں ایک لڑکا فیل ہو جاتا ہے۔۔ بتاؤ کیوں فیل ہو جاتا ہے؟''

بولا''اس نے محنت نہیں کی ہوتی۔''

میں نے کہا'' لیکن استاد نے تو سب کو با جماعت پڑھایا ہوتا ہے نا۔ جب ایک لڑکا فیل ہو جاتا ہے تو استاد یہ نہیں کہتا کہ تو نالائق تھا اس لیے فیل ہو گیا۔استاد کہتا ہے تو ''الو کا پٹھا ہے''۔۔۔پٹھا کہتے ہیں شاگرد کو۔۔اس کا مطلب ہے استاد خود کو الو کہتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ شاگرد فیل نہیں ہوا۔اسے پڑھانے والا فیل ہو گیا۔ انتیس لڑکوں کو پڑھانے والا ایک کو نہیں پڑھا سکا۔اب آئی سمجھ میں؟۔۔الو کا پٹھا۔۔۔کس کو کہتے ہیں۔''

بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔۔اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا '' اڑے ہاں ڑے ہاں۔۔۔ میں الو کا پٹھا ہوں۔۔۔اڑے میرے کو بولو ڑے میں الو کا پٹھا ہوں۔''

سارے ورکشاپ میں گھوما۔۔نعرہ لگانے لگا۔''اڑے سب میرے کو الو کا پٹھا بولو ڑے۔۔میں الو کا پٹھا ہوں۔''

میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی اور بولا''بس کر یار! تو میرا بھی جھگڑا کروائے گا۔بس چپ کر جا۔''

بولا''نہیں نہیں ۔میرے کو آج پتہ چلا ہے۔میں الو کا پٹھا ہوں۔۔آج سے سب میرے کو الو کا پٹھا بولو ڑے۔''

مجھے خدشہ پیدا ہو گیا کہ عارف تک بات پہنچی تو بدمزگی پیدا ہو جائے گی ۔میں نے کہا ''یار! بس بھی کر۔۔۔تو تو اعلان کرنے لگ گیا ہے''۔

بڑے جوش سے بولا ''نہیں استاد! میں الو کا پٹھا ہوں۔''

میں نے کہا'' تو مجھے استاد!۔۔کیوں کہہ رہا ہے۔''

بولا۔۔۔''نہیں استاد!۔۔میں الو کا پٹھا ہوں۔''

م۔ص۔ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے معیاری رسائل میں اِن کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔اندازِ بیان میں شستگی اور شائستگی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

مزاحیے

ڈاکٹر امواج الساحل

اور سب کچھ وہیں کا وہیں ہے

پنجاب کے ایک مضافاتی گاؤں سے ایک مزدور طبقہ نوجوان ایک کالے دھن (پٹرول) والے ملک میں اپنا مقدر بنانے چلا گیا، لیکن "جیہڑے پشور بھکلے اوہ لہور بھی بھکلے" کے مصداق جلد ہی اس کی وطن واپسی کے آرڈر جاری ہو گئے۔

آتے وقت اس کے گورے امریکی باس نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا کہ تمہارے ساتھ میرا اچھا وقت گزرا ہے، لہٰذا اسے رکھ لو، اگر کبھی ضرورت پڑے تو مجھے اس ایڈریس پر خط لکھ دینا، امریکا کے لئے تمہارا ویزا بھیج دوں گا۔

ان پڑھ بندے کو اس کی اہمیت کا کیا علم، اتنی توفیق اللہ نے دے دی کہ اسے سنبھال کر کہیں رکھ دیا۔ چند دن تو خوب آرام کیا، پھر گھر سے نکل کر گردونواح کا جائزہ لیا، کیا دیکھتا ہے کہ گھر کے سامنے ایک کوڑا کرکٹ کا جناتی سائز کا ڈھیر لگا ہوا ہے، جو گلشنِ معطر کا سماں پیدا کر رہا ہے۔ وہ بندہ جانتا تو تھا کہ اس ڈھیر کا مالی فائدہ ہے، یہ فصلوں میں بطور کھاد کام آتا ہے، اور اچھے داموں بک جاتا ہے مگر جہاں وہ کچھ عرصہ گزار کر آیا تھا، ابھی تک وہاں کی

صفائی دماغ میں بسی ہوئی تھی۔

پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ڈھیر ہمسایوں کی ملکیت تھا، اُن کو جا کر کہا کہ یہ آلودگی ہے اور بہت خطرناک ہے، میں اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔

اُنہوں نے اس کو طعنے دئے کہ کل تم یہیں سے گئے ہو، آج تمہیں یہ آلودگی یاد آ گئی؟

بات بڑھ گئی اور اس نے ان پر کیس کردیا، طرفین کے پیسے لگنے شروع ہو گئے مگر صلح کی بات کسی نے نہ سوچی، پولیس اور وکلاء کی تو چاندی ہی چاندی، بلکہ سونا ہی سونا تھا۔

جب بینک خالی ہو گئے، زمینیں بک گئیں، نوبت فاقوں تک آ پہنچی، تو اسے امریکی گورا یاد آیا، تلاش کرنے پر اس کا کارڈ مل گیا۔ اُسے خط لکھوایا، اور بھیج دیا، ایک ہفتے میں اس کا امریکا کا ویزا بھی آ گیا اور اس نے خود کو امریکا میں پایا اور کام کرنا شروع کردیا۔

معاشی مسائل سے فرصت ہوئی تو وہی ڈھیر پھر یاد آ گیا، پاکستان میں امریکن سفارتخانے کو درخواست دے دی کہ میری گھر کے سامنے کوڑے کا ڈھیر ہے، جس سے بوجہ آلودگی میرے بچوں کی صحت کو خطرہ ہے، لہٰذا اسے ہٹایا جائے۔

ایک دن گاؤں کے چیرمین کے گھر علاقے کا تھانیدار آیا۔ چیرمین نے کہا ''جناب، حسب دستور ہمیں بلا لیتے، آپ نے کیوں زحمت کی؟''

اُس نے کہا ''بات ہی کچھ ایسی ہے جناب کہ میرا آنا ضروری ہو گیا تھا۔''

تھانیدار نے موقعے کا معائنہ کیا اور چیرمین کے مشورے سے ایک لائحۂ عمل تیار کیا، جس کے مطابق ڈھیر کو ایک طرف ہٹا کر گھر کی تصاویر لی گئیں، بعد میں اسے وہیں منتقل کردیا گیا۔ ساتھ میں ایک لیٹر لکھا گیا کہ آلودگی ہٹا دی گئی ہے، اور مع تصاویر کے سفارخانے کو بھیج دیا گیا۔

یوں امریکا کو سکھ کا سانس آیا کہ ایک امریکی شہری کے گھر کے سامنے سے آلودگی ہٹ گئی اور بیماری کا خطرہ ٹل گیا۔ تقریباً بیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے، ڈھیر آج بھی وہیں قائم و دائم ہے۔

ڈاکٹر خورشید نسرین، ادبی دنیا میں امواج الساحل کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ قطر کے مختلف تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، عربی شاعری ان کا میدان سخن ہے، سب سے پہلے انکی رباعیاں قطر میں چھپیں، عرب شاعری کو ہائیکو سے روشناس کرایا، عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں افسانے ترجمہ کئے، اپنے بھی دونوں زبانوں میں لکھے، عربی شاعری کا اردو شاعری میں اور اردو شاعری کا عربی شاعری میں بھی ترجمہ کیا۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں مستقل لکھتی ہیں۔

جین نوجوانوں کا اتنا پسندیدہ لباس ہے کہ وہ اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتے ہیں۔ ویسے جین کی ایک پتلون دوسری تمام پتلونوں اور دیگر لباسوں کو یوں کھا جاتی ہے جیسے گناہ نیکیوں کو۔ جین ایک تو طلباء کی غربت اور جوانی پر بیک وقت پردہ ڈالتی ہے دوسرے یہ نظر بٹو کے طور پر بھی کام آتی ہے اور سب سے بڑھ کر دھوبی اور درزی روزمرہ زندگی سے یوں نکل جاتی ہے جیسے داڑھی رکھ لینے کے بعد شیو کا سامان۔ جین ایک بین الاقوامی لباس ہے اور اپنے بارے میں خود کہتی ہے۔ فیشن کی انتہا ہے بے تابی۔۔۔۔۔۔ اس مرض کی مگر دوا ہوں میں۔ جس طرح کسان بیج کو خاک میں ملا کر گل و گلزار کردیتا ہے اس طرح جین کے عشاق جین کو لنڈے بازار کی گانٹھوں میں سے نکال کر فرش پر اس حد تک رگڑتے ہیں کہ اپنے بھی خفا ان سے اور بیگانے بھی ناخوش۔ جین پوش جب سڑکوں پر نکلتے ہیں تو انہیں اپنی منزل پھل فروٹ کے ریڑھوں اور عورتوں کے پرسوں پر نظر آتی ہے کیونکہ انہیں جتنا مزہ عورتوں کے پرسوں پر جھپٹنے میں آتا ہے اتنا انہیں مجرموں کی پرورش گاہ کے ''چھتر کباب'' کھانے میں بھی نہیں آتا۔ **مزاج بخیر از تنویر حسین**

عاصمہ نورین

چچا میاں کے ہاں

ابھی چند روز قبل والد صاحب کے ایک عزیز کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ محترم حال ہی میں عمرے کی سعادت حاصل کر کے لوٹے تھے۔ ہمارا جانا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا کیونکہ کوئی رشتہ دار عمرہ کر کے آیا ہو اور اُسے اس کی مبارکباد بالمشافہ مل کر نہ دی جائے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ رشتہ دار اس کا ایسا فضیحتہ کھڑا کر دیتے ہیں کہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔

اس سلسلے سے وابستہ کچھ اتفاق بلکہ اتفاق کیا وہاں تو واقعات بلکہ حادثات کی قطار کھڑی تھی ہم سے بہ نفسِ نفیس ملاقات کرنے کے لئے۔۔۔ سوچا بہن بھائیوں کا بڑا حق ہوتا ہے لہٰذا اس ملاقات کی مزیداریوں سے محروم کرنا گناہِ عظیم کے مترادف ہے سو سنتے جایئے اور سر دھنتے جایئے۔

جانے سے قبل والد صاحب نے حسبِ روایت گھر کے اندر سے ایک عدد ہار دریافت کر لیا جو اسی سعادت کے حصول کے لئے لیا گیا تھا لیکن بوجوہ کسی کے گلے کی زینت بننے سے محروم رہا تھا۔ میں نے لاکھ منع کیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنتا ہے۔ ابا جان نے اس ہار کو بصد اہتمام ایک پرانے اخبار میں لپیٹا اور ہم اس مہم کے لئے وارانہ ہوئے۔

پہلے تو سواری کا ملنا محال ہوا پھر جب سواری ملی اور ہم اُس پر سوار ہو کر متعلقہ جگہ پہنچے تو مکان کہیں گلیوں کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ کسی نہ کسی طرح مکان ڈھونڈ ڈھانڈ کر پہنچے۔

سردیوں کے دن تھے چنانچہ صاحبِ خانہ نے اندر سردی کا مکمل توڑ کرتے ہوئے فل سائز ہیٹر آن کر رکھا تھا۔ لہٰذا ہم سب بخیر و عافیت پُرسکون ماحول میں پہنچ چکے تھے۔

ہار اُن چچا میاں کے گلے میں ڈال دیا گیا کہ وہ ماشا اللہ عمرے کی سعادت حاصل کر کے لوٹے تھے۔ اب بیٹھ کر باتیں

جب شروع ہوئیں تو ایک عجیب سا ماحول بن گیا۔ گفتگو کی گاڑی جب کچھ آگے بڑھی تو انکشاف ہوا کہ میزبان کچھ اونچا سنتے ہیں۔ اِدھر والد صاحب کو بھی یہی مسئلہ لاحق تھا۔ چنانچہ سچویشن اُس وقت خاصی دلچسپ ہوگئی جب کہا کچھ گیا اور سمجھا کچھ۔ یعنی ایک نقطے نے ہی محرم کو مجرم نہیں بنایا تھا بلکہ وہاں تو نقطوں کی بوریاں کی بوریاں ذخیرہ تھیں۔

اب جو صورتحال بنی وہ کچھ یوں تھی۔

''بہت مبارک ہو! مجھے پہلے معلوم ہوتا میں خود آتا تمہیں چھوڑنے جاتا۔'' والد صاحب نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

جواب ملا ''ہاں جی چار ہی بیٹیاں ہیں۔۔۔ بیٹا ایک ہی ہے بس۔۔۔''

ہاں نا وہی تو۔۔۔ مجھے تو اسلم نے بتایا کہ تم گئے ہو عمرے پر۔۔۔ تو بہن جی کو وہیل چیئر پہ بٹھا کر کرایا ہے عمرہ؟''

''نہیں نہیں۔۔۔ گوجرانوالہ گئے نا۔۔۔ ادھر سے ایک داماد بھی تھا ساتھ۔۔۔''

''ویسے سعی کرتے ہوئے بہت مزہ آیا ہوگا آپ کو؟''

''نہیں نہیں۔۔۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔''

''بس آپ خوش قسمت ہیں، اللہ کرے مجھے بھی جلد عمرہ نصیب ہو۔۔۔ بہت شوق ہے مجھ کو۔''

''بس، اِن بیماریوں سے اللہ بچائے۔''

یہ تو ایک طرف کا منظر تھا، مزید برآں ایک ماں جی بھی ایک بستر میں کیموفلاج ہو کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی بس یہی استفسار کرتی رہیں ''عمرہ کیا آپ نے؟''

جواب اثبات میں ملنے پر بھی اُن کی تشفی نہ ہوئی، تو اتر سے اپنے اسی سوال کو دھراتی رہیں۔

ہمارے ساتھ میری چھوٹی ہمشیرہ بھی تھیں جو اس سب ہنگامے سے بے نیاز اپنی بھانجی کے ساتھ کھجوریں جھمنے میں مصروفِ عمل رہیں اور جب ان ماں جی نے کھنکار کر کہا کہ بیٹی مٹھائی بھی کھاؤ ناں۔ (یقیناً اُن کا مطلب تھا کہ اب کچھ کھجوریں کسی اور کے لئے بھی چھوڑ دو) تو ہمشیرہ صاحبہ جو کہ بھانجی کے ہاتھ سے برفی کھینچ کر کھانے میں برسرِ پیکار تھیں ہڑبڑا کر بولیں ''بس اوہ مدینہ نی کجھور کھانے نے بعد کوی اور شے کس طرح کھاواں؟''

اور۔۔۔ برفی کا ٹکڑا پسیج کر ہاتھ سے فرش پر گر گیا۔

عاصمہ نورین صاحبہ کا تعلق واہ کینٹ سے ہے۔ وہاں کے ایک تعلیمی ادارے میں بطورِ معلّمہ فرائض سرانجام دے رہی ہیں۔ تعلیمی پسِ منظر میں ''کمپیوٹر سائنس'' میں ایک عدد ماسٹر ڈگری کی مالک ہیں۔ لکھنے لکھانے کا شوق بہت ہے۔ خصوصاً طنز و مزاح میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' میں یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔ اُمید ہے کہ شگوفے کھلانے کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیں گی۔

میرا تجربہ ہے کہ پکانے کے وقت کمرے سے زینہ زیادہ کارآمد رہتا ہے۔ سب سے پہلے میں ان چیزوں کو اکٹھا کر لیتا ہوں جنہیں گم ہو جانے کی بڑی عادت ہے مثلاً چاقو' چمچ' پنکھا وغیرہ اور انہیں سیڑھیوں پر رکھ دیتا ہوں۔ اس پر انگیٹھی سے اوپر حمام نیچے نل تلے بالٹی اور باقی ضروریات' اس طریقہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ چیزیں درجہ بدرجہ پڑی رہتی ہیں اور آپ خود پولیس کی طرح چاق و چوبند کھڑے رہتے ہیں آپ کو چاقو کی ضرورت پڑی ایک نظر دوڑائی وہ رہا چاقو' آپ گلیور بن جاتے ہیں اور جملہ سامان آپ کی آنکھ تلے باشتیوں کی طرح آپ کی زد میں رہتا ہے اور آپ کی دست درازی کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔

غبارے از ممتاز مفتی

اقبال حسن آزاد

عطّو بھائی

عطو بھائی کو آفس پہنچنے میں روز دیر ہو جایا کرتی تھی۔ اکثر باس سے جھڑکیاں کھاتے۔ایک روز جب وہ اپنے ٹیبل پر منہ لٹکائے بیٹھے تھے تو ان کے دوست عزیز بھائی ان کے پاس آئے اور خیر وعافیت دریافت کرنے کے بعد ان کی اداسی کا سبب پوچھنے لگے۔عطو بھائی نے گلوگیر آواز میں اپنی بپتا سنانی شروع کی۔ کہنے لگے کہ آفس گھر سے کافی دور ہے۔ٹرانسپورٹ سسٹم کے ناکارہ پن کی وجہ سے انہیں آفس پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور باس کی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔عزیز بھائی بولے ''اس مسئلہ کا ایک آسان حل ہے۔''

عطو بھائی نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا ''وہ کیا؟''

''آپ ایک موٹر سائیکل خرید لیجیے۔''

عطو بھائی نے افسردہ لہجے میں کہا'' آپ کی تجویز تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟''

عطو بھائی نے ایک آہ سرد بھر کر کہا ''مجھے موٹر سائیکل چلانا نہیں آتا۔''

عزیز بھائی نے ان کی بات سن کر زور کا قہقہہ لگایا اور بولے ''موٹر سائیکل چلانا کون سی بڑی ہے۔لوگ ایک دن میں سیکھ لیتے ہیں۔''

''لیکن مجھے سکھائے گا کون؟''

''میں سکھاؤں گا اور کون؟''

عزیز بھائی کی بات سن کر عطو بھائی کے چہرے پر ایک آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی اور یہ طے پایا کہ وہ فی الفور ایک موٹر سائیکل خرید لیں اور اتوار کے روز عزیز بھائی انہیں اسے چلانا سکھا دیں گے۔ چنانچہ عطو نے فوراً ایک موٹر سائیکل خرید لی اور شو روم کا ڈرائیور انہیں پیچھے بٹھا کر گھر پہنچا گیا۔انہوں نے عزیز بھائی کو اس کی خبر دے دی اور انہیں اتوار کا وعدہ یاد دلایا۔عزیز بھائی نے پُر جوش لہجے میں انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ اتوار کو وہ صبح دس بجے آ جائیں گے۔ بھابھی سے کہنا کہ چکن بریانی، مٹن فرائی، مٹر پنیر، سلاد، رائتہ، شاہی ٹکڑا اور میٹھا پلاؤ تیار کر رکھیں۔

عزیز بھائی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور اتوار کے روز عطو بھائی کی بیگم صبح سے ہی باورچی خانے میں جٹ گئیں۔عزیز بھائی حسب وعدہ دس بجے پہنچ گئے۔عطو بھائی نے ان کا تہہ دل سے استقبال کیا اور کہا کہ چلیے، پاس کے اسکول گراؤنڈ میں موٹر سائیکل سیکھنے چلتے ہیں۔عزیز بھائی نے کہا ''ارے بھائی! ابھی ابھی تو آیا ہوں۔ذرا چائے کافی پلواؤ۔ایک دو ہاتھ تاش کی بازی ہو جائے، پھر چلتے

ہیں۔"

چنانچہ اُن کے لیے چائے اور لوازمات کا انتظام کیا گیا۔ پھر تاش کے پتے پھیلائے گئے۔ یہ سب ہوتے ہواتے بارہ بج گئے۔عطو بھائی نے پھر پر تولے۔عزیز بھائی بولے "اب تو تھوڑی دیر میں کھانے کا وقت ہو جائے گا۔اس کے بعد چلیں گے۔ جب تک دو چار بازیاں اور ہو جائیں۔"

چنانچہ دونوں پھر کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔لگ بھگ دو بجے کھانا چنا گیا۔عزیز بھائی نے چٹخارے لے لے کر خوب ڈٹ کر کھایا۔اور پھر ایک لمبی ڈکار لے کر صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔عطو بھائی نے ایک بار پھر انہیں یاد دلایا کہ وہ انہیں موٹر سائیکل سکھانے آئے ہیں چنانچہ اب یہ نیک کام کر ہی دینا چاہیے۔

عزیز بھائی نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا کہ بھائی کھانا بہت لذیذ بنا تھا۔ میں نے بھی شکم سیر ہو کر کھایا۔ بھابھی کا شکریہ۔ اب ذرا نیند آ رہی ہے اور باہر دھوپ بھی سخت ہے۔ایسا کرتے ہیں کہ سورج ڈھلنے کے بعد نکلتے ہیں۔

عطو بھائی صبر کا گھونٹ پی کر رہ گئے اور شام کا انتظار کرنے لگے۔دو گھنٹے قیلولہ فرمانے کے بعد عزیز بھائی بیدار ہوئے اور عطو بھائی سے موٹر سائیکل باہر نکالنے کو کہا۔وہ سمجھے کہ عزیز بھائی انہیں موٹر سائیکل پر بٹھا کر اسکول کے میدان میں لے جائیں گے مگر وہ کہنے لگے "آپ موٹر سائیکل ہاتھوں میں تھام کر پیدل پیدل چلیے۔اس سے آپ کو ہینڈل پکڑنے کا تجربہ بھی ہوگا اور ٹہل کر جانے سے کسلمندی بھی دور ہوگی۔"

لہٰذا عطو بھائی نے دونوں ہاتھ سے موٹر سائیکل کا ہینڈل تھاما اور دونوں یار پیدل پیدل اسکول کے میدان میں پہنچے۔وہاں پہنچ کر عزیز بھائی نرم نرم گھاس پر ایک کنارے بیٹھ گئے اور عطو بھائی کو بھی اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔عطو بھائی بولے "بھائی تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو جائے گا۔ آج جتنا سکھا سکتے ہیں سکھا دیں۔"

عزیز بھائی ان کی بات سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولے "سچی بات تو یہ ہے بھائی کہ مجھے بھی موٹر سائیکل چلانا نہیں آتا۔"

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (بھارت) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے "قطرہ قطرہ احساس" (۲۰۰۵)،"مردم گزیدہ" (۲۰۰۵) اور "پورٹریٹ" (۲۰۱۷) شائع ہو چکے ہیں۔چوتھا مجموعہ "اوس کے موتی" زیرِ ترتیب ہے۔"ارمغانِ ابتسام" کے خصوصی کرمفرما ہیں۔

گزشتہ کئی دنوں سے لاہور شہر کی سڑکوں کو تجاوزات سے پاک کرنے کا نعرہ لگایا جا رہا ہے لاہور کی انتظامیہ، میٹرو پولیٹن کارپوریشن اور ایل ڈی اے کے اشتراک سے شروع ہونے والا یہ منصوبہ اخباری اطلاعات کے مطابق اب عید کے بعد تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے البتہ میاں نواز شریف کے گھر کے قریب تجاوزات چونکہ بہت ہی زیادہ "ناجائز" تھے اس لیے ان کا صفایا کر دیا گیا ہے۔اول تو ہمیں "تجاوزات کے ساتھ یہ "ناجائز" کا سابقہ، بہت عجیب محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس سے جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ کچھ تجاوزات جائز بھی ہوتے ہیں اب یہ تجاوزات کون سے ہیں اور کیسے ہیں؟ ان پر اہل علم تو غالباً کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے البتہ اہل اقتدار کی وضاحت سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ وہ تجاوزات جو ان کی طرف سے یا ان کی اجازت اور آشیرباد سے ہوں انہیں "جائز تجاوزات" کہا جاتا ہے۔

پرانی آنکھیں نئے خواب از امجد اسلام امجد

مغربی اسلوب کی ماری ہوئی کچھ لڑکیاں
بات کرنا اینگلو اُردو میں سمجھیں فرض بھی

کر رہی تھیں گھر میں پنکی بات یہ سسٹرز سے
پڑھ کے امریکہ سے آئے ہیں مرے سسرز بھی

باجی سچ مانو وہ اپنی "جینز" میں "شاہینز" ہیں
وہ لگیں ٹیچرز بھی ایکٹرز بھی شوہرز بھی

"مسجدز" میں جا کے یہ کوئی کہے "ملاز" سے
رنگ کچھ کلچرز میں بھرتے تو ہیں کافرز بھی

پھیکی پھیکی کیوں نہ ہو کالجز کی بزم سخنز
اب کہاں اقبالز اور غالبز سے شاعرز بھی

سیّد ضمیر جعفری

وہ میں نہیں ہوں

فیس بُک اکاونٹ ہیک ہونے کے بعد تاثراتی نظم۔۔۔ جب یونان گریس سے کسی صاحب نے ہمارا اکاونٹ ہیک کر کے ہمارے دوستوں سے ہمارے نام پر قرض مانگنا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جو فیس بُک پر ہے اک سوالی، وہ میں نہیں ہوں
کسی نے ''آئی۔ڈی'' مری چُرا لی، وہ میں نہیں ہوں

جو نام پر میرے دھوکا دیتا ہے، اور ہے وہ
وہ جس کو دیتے ہیں آپ گالی، وہ میں نہیں ہوں

Greece خواب و خیال میں بھی نہ جا سکا تھا
گریس جس نے مجھے لگا لی، وہ میں نہیں ہوں

وہ میری بیگم کے تایا ابا کا سالا ہو گا
یا اس کے خالو کی ہو گی سالی، وہ میں نہیں ہوں

نہ کشتہ بیچوں نہ رکھوں معجون، میں مطب میں
وہ جس سے تھی آپ نے دوا لی، وہ میں نہیں ہوں

میں تازہ تازہ کلام نیٹ پر اُتارتا ہوں
کرے جو اشعار کی جگالی، وہ میں نہیں ہوں

تڑی جو دیتا ہو فیس بک پر نکال پیسے
یقین جانو ہے وہ وبالی، وہ میں نہیں ہوں

ٹرالی اڈے پہ جس نے اڈہ جمایا، میں تھا
مگر جو اب ہے بمع ٹرالی، وہ میں نہیں ہوں

میں فوج کو نوج موج مستی میں کیوں کہوں کچھ
مجھے نہیں جانا کوتوالی، وہ میں نہیں ہوں

مجھ ایسے معصوم سادہ شاعر پہ دے نہ فتویٰ
کہ جس نے داڑھی مری لگا لی، وہ میں نہیں ہوں

جہاز سے میں تو یو۔کے اب جانا چاہوں مظہرؔ
کہ راہ جس کی ہے ''راہوالی''، وہ میں نہیں ہوں

منفی کلاسیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آج کل تین سے چار سال کی عمر میں بچوں کی تعلیم کا آغاز کر دیا جاتا ہے اور پہلی جماعت تک پہنچنے کے لئے تین جماعتوں (پلے گروپ نرسری اور کے جی) کے پُل صراط کو عبور کرنا پڑتا ہے، میں ان جماعتوں کو منفی جماعتیں کہتا ہوں کہ صفر سے پہلے یہی گنتی کا اصول ہے۔

داخلے بچوں کے ''ٹینشن'' ہو رہے ہیں آج کل
بارہ بارہ گھنٹے ''سیشن'' ہو رہے ہیں آج کل
علم سے مضبوط بندھن ہو رہے ہیں آج کل
نرسری میں ''کنونیشن'' ہو رہے ہیں آج کل

داخلے بچوں کے پنگھوڑوں میں ہوتے ہیں یہاں
چُسنیاں پیتے ہوئے بچے چلے آتے ہیں یاں

پیمپر پہنے ہوئے، باندھے ہوئے ہیں رال بند
جکڑے ہیں کپڑوں میں ایسے، ہوگئی ہے چال بند
جانے مستقبل خدا، فی الحال تو ہے حال بند
آہ و گریہ نے کئے بچوں کے سب سُر تال بند

زندگی سے دیکھئے کیا ہے ملا محصول میں
کھیلنے کا وقت تھا جن کا وہ ہیں اسکول میں

بولنی آتی نہیں ہے گو زبانِ مادری
اِن کو سکھلانے کو ہیں تیار سارے ''اے بی سی''
کہہ رہے ہیں وہ زبانِ حال سے رو کر یہی
ہے کوئی یاں بات جو سمجھے ہماری توتلی

مرزا غالب نے ہمارے واسطے ہی تو کہا
''مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا''

ہاتھ میں پنسل پکڑنے کی نہیں طاقت ذرا
پھر بھی میڈم ہیں بضد لکھیں سبق صبح و مسا
دل ہے انکا کھیل میں، پڑھائی کیسے ہو بھلا
نگلی جاتی ہی نہیں کڑوی ہے تعلیمی دوا

مضطرب ہیں ساتھیوں کا دیکھ کر یہ حالِ زار
رو رہے ہیں جھولنوں میں ڈر کے مارے شیر خوار

اک طرف مظلوم بچے اک طرف بے کس عوام
تاجرانِ علم کے آئے ہیں دونوں زیرِ دام
کیا بتائیں آپ کو کیسا ہے تعلیمی نظام
دس کلو بستے میں ہے تعلیم خالی دس گرام

ہے سفر لمبا بہت منزل تمہیں تڑپائے گی
نونہالو! تین سالوں بعد پہلی آئے گی

م۔ش۔عالم

اتنی تیزی سے مت چڑھا سگریٹ
پھر کہے گا کہ چڑھ گیا سگریٹ

بھر گیا جب دماغ سوچوں سے
ہم نے بھی ایک ''بھر لیا'' سگریٹ

ہم پھر اُڑنے لگے ہواؤں میں
پی لیا جب ''بھرا ہوا سگریٹ''

کیا کہا، گولڈ لیف ہے تیرے پاس
چل اِسی بات پر لگا سگریٹ

ہم ہیں ''سگرِٹ'' کے اس قدر رسیا
جب پیا، مانگ کر پیا سگریٹ

شاید ایسے، سُرور بڑھ جائے
آجا! سگرٹ سے ہی ملا سگریٹ

مجھ کو تو گیس کا مرض ہے میاں!
تو بتا! تو نے کیوں پیا سگریٹ

ایک سگریٹ تھا اور دو طالب
آدھا آدھا ہی کر لیا سگریٹ

کش لگایا تھا اُس نے پہلی بار
اور پھر اُس کو چڑھ گیا سگریٹ

میں نے دیکھا دھواں دھواں تھی بس
پی رہا تھا کوئی ''گدھا'' سگریٹ

میزباں بولے ''کیا پئیں گے آپ''
میں نے کچھ سوچ کر کہا ''سگریٹ''

ہوگئے ہیں یہاں بہت مہنگے
بھیج دے اب تو ''چائنا'' سگریٹ

بجھ گیا دل بھی اپنا جب عالمؔ
بیوی بولی کہ ''چل بُجھا سگریٹ''

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں ''یہ'' کام کرنے میں

ضرورت مند بندے کی
اَشد امداد کرنے میں
بلا تاخیر جب کوئی قدم فوری اٹھانا ہو
کسی رنڈوے کو اِک معقول رشتے کا بتانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں!

بطور عینی شاہد جب
کسی کمزور کو ڈنڈوں سے پٹتا دیکھنے پر
اگر دستِ ستمگر سے
وہ ڈنڈا چھین لینے کا ڈرامہ سا رچانا ہو
کسی شوہر کو بیوی کے
تشدد سے بچانا ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں!

ظفر اقبال کے سوئے تتبع میں
کسی کی شاعری کے شہرِ دلکش کو
کھدائی کے کسی بھی آپریشن کی مدد سے
نہایت ہی ہڑپہ رو بنانا ہو
کسی کی ''بے غزل لغزش'' کو بھی معصوم کہنا ہو
سخن میکر کے ٹولے کو بتانا ہو
کہ تم اس دور کے ہو میر اور تم تو یگانہ ہو
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں!

کسی کو تاڑنا لازم ہو
دس ڈگری کے اینگل سے
کسی کی نیلگوں آنکھوں کے
لینزوں میں اترنا ہو
اگر مجھ کو اچانک عشق کرنا ہو!
ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں!

ڈاکٹر عزیز فیصل

کرکٹر اور شاعر

احمد علوی

اِن کی نظروں میں ہیں سب شاعرِ اعظم بے کار
آج ہر لڑکی کے اعصاب پہ کرکٹ ہے سوار
اِن کو شاعر کوئی اس دنیا میں بھاتا ہی نہیں
اِن کو کرکٹ کے سوا کچھ نظر آتا ہی نہیں
اِن کو بلبل نہیں بھاتی انہیں گرگٹ ہے پسند
لڑکیوں کو مری غزلیں نہیں کرکٹ ہے پسند
لڑکیاں غالبِ و اقبال سے نا واقف ہیں
میر و سودا کے بھی احوال سے نا واقف ہیں
ان کے پیارے تو ہیں عمران، سچن ٹنڈولکر
فنِ شعری کو بتاتی ہیں یہ بے ہودہ ہنر
راحت اندوری پسند ان کو نہ انجم رہبر
ان کو گلزار لگے پیارا نہ جاوید اختر
یہ نہیں مانتیں نیرج ہوں کہ ہوں اندیور
بس گئے ان کی نگاہوں میں کپل اور اظہر
یہ ملک زادہ سے واقف ہیں نہ اجلال سے ہیں
خوب آگاہ یہ کرکٹ کی ہر اک بال سے ہیں
مجتبٰی ان کو پسند آئے نہ یوسف ناظم
ان کی نظروں میں دلاور نہ منور عالم
مجھ کو ہو کیوں یہ شکایت کہ مری قدر نہیں
ان کی فہرست میں شاعر بشیر بدر نہیں

بن گئے آبرو ڈائس کی بریلی کے وسیم
پاس ان کے نہیں پھٹکی کوئی نکہت نہ نسیم
عمر بھر گھستے رہے کیفی و مجروح قلم
اک حسینہ کا بھی ان پر نہ ہوا خاص کرم
ان کا کہنا ہے حسینوں کا تھا پیارا ساحر
اٹھ گیا پھر کیوں زمانے سے کنوارا ساحر
ساری دنیا میں اسے ایک بھی شاعر نہ ملا
رینا رائے نے بھی تو پاک کے محسن کو چنا
ایک شرمیلا تھی جو ایک پٹوڈی سے پٹی
کوئی ٹن ٹن بھی پٹائی ہو تو بتلائے کوی
بیوی والے بھی کنوارے سے نظر آتے ہیں
سارے شاعر ہی بچارے سے نظر آتے ہیں
کوئی معشوق ملی گوری نہ کالی ان کو
حسن والوں نے کبھی گھاس نہ ڈالی ان کو
ان حسیناؤں کو بس اتنا ہی غم ہے یارو
ان کو بلے کی طلب ہم پہ قلم ہے یارو

آزادی

ایک امریکی سٹیزن نے یہ رشین سے کہا
صرف امریکہ میں آزادی کا ہے اصلی مزا

چشمِ تر میں ڈوب مرنے کے لئے آزاد ہیں
سارے عاشق عشق کرنے کے لئے آزاد ہیں

بیویاں آزاد ہیں، اُن کے میاں آزاد ہیں
خواب گاہوں کی یہاں پر کھڑکیاں آزاد ہیں

صرف امریکہ زبانوں پر نہیں پابندیاں
ہر کسی کو بولنے کی ہیں یہاں آزادیاں

اتنی آزادی ملے گی اور دنیا میں کہاں
صدرِ امریکہ کو بک سکتے ہو جم کر گالیاں

سن کے امریکی کی باتیں پھر یہ رشین نے کہا
گالیاں بکنے کی آزادی نہیں ہے مسئلہ

رُوس میں بھی روسیوں پر ایسی پابندی نہیں
اس طرف سے روسیوں کی ذہنیت گندی نہیں

اِتنی آزادی تو ہر روسی کو حاصل ہے یہاں
صدرِ امریکہ کو بک سکتا ہے کھل کر گالیاں

احمد علوی

OLX

فالتو سامان سارا، بیچ دے
جو نہیں تجھ کو گوارا، بیچ دے

ایک دو بیکار ہیں پیپر کٹر
ساتھ میں بیکار آرا، بیچ دے

بھینس تو مانا ہے تیرے کام کی
جو بچا کرتا ہے چارا، بیچ دے

تین جو تیرے پرانے سوٹ ہیں
ایک سے کر لے گزارا، بیچ دے

ایک اسکوٹر پرانی آئے گی
دو قمیصیں اک غرارا بیچ دے

تیرا بیچا، گر تجھے بیچا گیا
سوچتا کیا ہے دوبارہ بیچ دے

آج کل ان کی بھی کافی مانگ ہے
قافیہ یا استعارہ بیچ دے

گر ملیں اشیاء نہ کوئی فالتو
کوئی بھی قومی ادارہ بیچ دے

ایڈ ایسا بھی نظر چکرا گیا
کوئی ہے! جو اک کنوارہ بیچ دے؟

لیک ہوتا جا رہا ہے دن بہ دن
شانؔ جیون کا غبارہ بیچ دے

صحافی

یہ تم کس زعم میں ہو جی!

صحافی ہوں

چنانچہ آشنا ہر مکر سے ہوں میں!

تمھیں اسکینڈلوں میں بھینچ سکتا ہوں

بڑے تم مجھ سے چاہے جتنے ہو جاؤ

تمھاری ٹانگ تو میں کھینچ سکتا ہوں

نوید ظفر کیانی
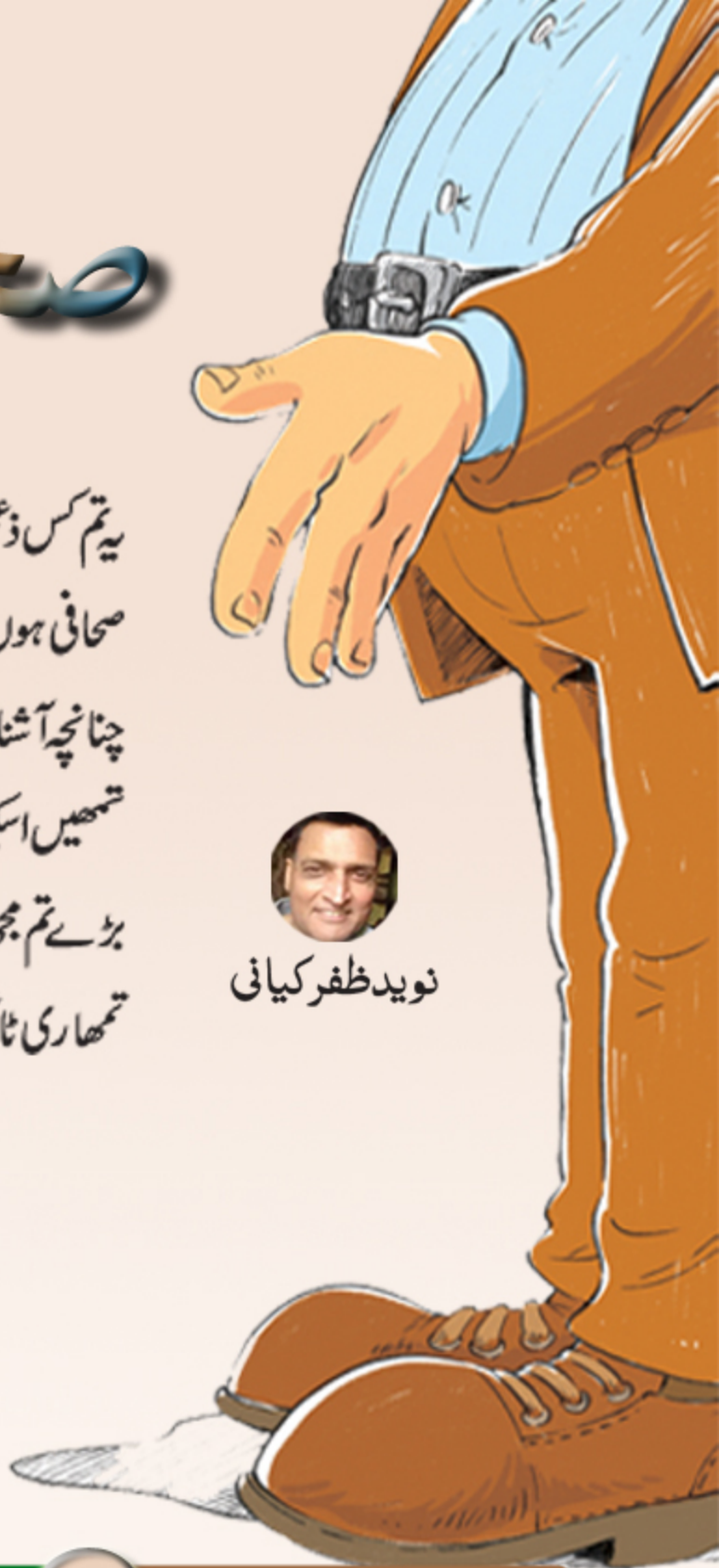
محمد علی بٹ عالیؔ

بہت نازک سی لڑکی تھی بڑا مجھ کو ستاتی تھی
میں اِتنا Cool سا لڑکا وہ مجھ کو Fool بناتی تھی

ابھی دو دن ہی گزرے تھے یہ دل میں ہار بیٹھا تھا
میرے سپنوں کی حد دیکھو، اُٹھائے ''ہار'' بیٹھا تھا

پری چہرہ، سریلی سی، میں سچ مچ ''کوئین'' سمجھا تھا
وہ بے ہنگم سی لڑکی تھی جسے میں ''بین'' سمجھا تھا

یہ کل پرسوں ہی ''فادر'' کو کیا جو اس نے ''Tag'' اپنے
اُسی فرصت میں ٹوٹے تھے ''بَستی'' کے سبھی سپنے

جو ہر عاشق کو اپنا نام ''ڈِمپل کوئین'' بتاتی تھی
وہ اِک درزی کی بیٹی تھی فقط ''کچھے'' بناتی تھی

ڈاکٹر عارفہ صبح خان

جوتیوں کا ڈاکٹر

جی!! یہی جوتیوں کا ڈاکٹر ہے۔ لاہور کے پوش علاقے میں اس کی کوٹھی ہے۔ بنک میں کئی لاکھ روپے ہیں۔ گھر میں ایک بیوی اور سات بچوں کے علاوہ ایک باپ، دو ملازم اور پرائز بانڈ ہیں۔ بیوی کے پاس لگ بھگ پچیس لاکھ کا زیور ہے۔ وہ لاہور کا سب سے مشہور اور بڑا ڈاکٹر ہے۔ شہر کی معروف سڑک پر اس کا کلینک ہے۔ یہ کلینک چند گز کے ٹکڑے پر لکڑی اور لوہے کے ٹین کی مدد سے قائم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خود پھٹے پر بیٹھتا ہے اور مریضوں کو بنچ پر بٹھاتا ہے۔ معزز اور امیر قسم کے لوگوں کو ان دو کرسیوں پر بٹھاتا ہے جو پھٹے کے بالکل ساتھ رکھی ہوئی ہیں۔ یہ جوتیوں کا ڈاکٹر ہے جسے عرف عام میں موچی ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام تو شائد شناختی کارڈ یا نکاح نامے میں ہی درج ہو گا لیکن گھر والے اور باہر والے مدت ہوئی اس کا اصلی نام بھول چکے ہیں۔ خود اُسے بھی اپنا اصلی نام یاد نہیں رہتا۔ اپنے نام کی کنفرمیشن اسے شناختی کارڈ دیکھ کر کرنی پڑتی ہے۔ بیوی اسے ''جانی'' کہتی ہے۔ ماں کی دیکھا دیکھی بچے بھی باپ کو ''ابو جانی'' کہتے ہیں۔ باپ بھی گھر والوں کی پیروی میں بیٹے کو ''پتر جانی'' کہہ کر بلاتا ہے۔ دوست احباب اور رشتہ داروں کو بھی اسے یار جانی کہنے کی عادت پڑ چکی ہے البتہ محلے والے اور جاننے والے بلکہ نہ جاننے والے بھی اسے احتراماً موچی ڈاکٹر کہہ کر بلاتے ہیں۔ باپ کا کہنا ہے کہ تقریباً پچپن سال پہلے اس کا نام رکھا گیا تھا اب چونکہ نصف صدی پرانی بات ہے اس لئے حافظے سے محو ہو چکی ہے، باپ سے جب نام پوچھو، کہتا ہے کہ نصف درجن لڑکے اور نصف درجن لڑکیاں دو بیویوں نے مل کر جنم دئے۔ دونوں کو بچے پیدا کرنے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا خبط تھا۔۔۔ اس مقابلے بازی میں میں آدھا رہ گیا۔ کبھی شیخو پورہ کے کھیتوں میں ہل چلاتا ۔کبھی رڑی بیچتا۔ کبھی کوئلے بیچتا تو کبھی اپنا آبائی کام یعنی جوتیاں گانٹھا کرتا تاکہ کسی طرح سترہ آدمیوں کے کنبے کا پورا ڈال سکوں ۔۔۔ دو ماں باپ ،بارہ بچے، دو بیویاں اور خود میں ۔۔۔ باہر بھی اوور ٹائم لگاتا اور گھر میں بھی۔ چند ہی سال میں پینتیس سال کی عمر میں پچپن کا نظر آنے لگا ،نظر گری، بال گرے ،صحت گری اور پھر رہا سہا حافظہ بھی گر گیا۔ لوگ آ کر بتاتے کہ یہ آپ کا بچہ نالی

میں گرا پڑا ملا ہے۔۔۔کبھی کارپوریشن سے لوگ آجاتے کہ آپ کا سلسلہ ہائے روزگار کیا ہے، میں بتاتا کہ ہم جدی پشتی موچی ہیں ،وہ پوچھ بیٹھتے اِتنا لمبا چوڑا کنبہ کیسے پالتے ہو۔۔۔یہ گھر ہے یا کوئی مرغی خانہ؟؟کبھی پولیس والے آجاتے کہ جی یہ آپ کا ہی بچہ ہے ہم نے اسے فیضو پرچون والے کی دوکان سے چوری کرتے ہوئے پکڑا ہے۔میں دونوں بیویوں کو بلا کر کہتا کہ ارے کمبختو! دیکھو یہ کون سی والی کا بچہ ہے، اپنا ہی ہے یا کسی محلے والے کا ہے ،ارے مجھے تو دکھائی نہیں دیتا۔۔۔تم ہی بتاؤ یہ کس کا ہے ؟؟؟تب ان میں سے ایک بچے کو چمکار کے کہتی کہ ہائے کس کا ہوتا ارے میرا لڑکا ہے، ابھی لڑکا ہے بسکٹ ٹافی چرائی ہے کوئی فیضو کا سونا چاندی نہیں چرایا کہ پولیس بھیج دی کمینے نے۔

دوسری بیوی اِس موقعہ پہ اپنی سوکن اور سوتیلے بچے پر اتنے الزام لگاتی کہ پولیس والا وہیں کھڑا ہو کے پرچہ کاٹنے لگتا، غرض موچی ڈاکٹر کا باپ جو اپنے پیشے میں کمپوڈر ثابت ہوا تھا۔۔۔بڑی سوچ بچار کے بعد یہ کہتا کہ اس کا نام شاید شرمسار، ہوشیار یا ساہوکار ہے۔سرشار کی سوتیلی ماں فٹ کہتی ''ارے چھچھوندر ہے چھچھوندر۔۔۔جس جوتی سے چمٹ جائے تو اس کے پیندے سے ہی چپک جاتا ہے، ہائے ہائے شکل تو بن مانس جیسی ہے مگر ہے نرا چھچھوندر۔۔۔چھچھوندر نہ ہو تو۔۔۔آیا بڑا موچی ڈاکٹر۔شیخوپورہ کا شیخوخورہ۔۔۔کہتا ہے کہ بزنس مین ہیں اور لوگوں سے سرجن کہلواتا ہے۔ہونہہ!''

جب تک سرشار عرف موچی ڈاکٹر شیخوپورہ میں رہا۔۔۔جوتیاں مرمت کرنے کے علاوہ اپنی لالوکھیت والی ماں حسن آراء سے گاہے بگاہے جوتیاں کھاتا اور طعنے سنتا رہا۔موچی ڈاکٹر کی خوش قسمتی تھی ایک دن اس کی سگی اور سوتیلی ماں لڑ پڑیں اور ؎

لڑتے لڑتے ہوگئی گم
ایک کی چونچ ایک کی دم

کے مصداق دونوں نے ایک دوسرے کو خوب کوٹا۔۔۔دونوں دو دن کے اندر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئیں۔موچی ڈاکٹر لاہور بھاگ آیا۔لاہور میں موچی ڈاکٹر کے بھاگ کھل گئے۔

پہلے وہ اکڑوں بیٹھ کر جوتیاں گانٹھا کرتا تھا پھر چوکی پر بیٹھنے لگا اور اب خیر سے لکڑی کے تخت پر بیٹھ کر جوتیوں کا معائنہ کرتا ہے پھر مرمت کرتا ہے بعض جوتیوں کی سرجری کرنی پڑتی ہے وہ چھ برس کی عمر سے جوتیوں کو ٹانکے لگا رہا ہے۔اسے جوتیوں میں رہنے کا پچاس سالہ تجربہ ہے۔وہ جوتی کی اتنی عمدہ مرمت کرتا ہے کہ پرانی جوتی بھی نئی لگنے لگتی ہے اس نے ہر قسم کی جوتیوں کے ریٹ مقرر کر رکھے ہیں اس کے کلینک پر بہت رش ہوتا ہے اور ڈیٹ مشکل سے ملتی ہے۔بعض جوتیاں اس کے پاس ایک ماہ بھی زیر علاج رہی ہیں ایسی جوتیوں کے کیس پیچیدہ اور مشکل ہوتے ہیں ان کی ہارٹ سرجری کرنی پڑتی ہے۔بعض کی پلاسٹک سرجری ہوتی ہے اور اکثر جوتیوں کی کاسمیٹک سرجری کی جاتی ہے اور بعض جوتیوں کو معمولی مرمت کرنا ہوتا ہے اور کچھ جوتے تو ایسے ہوتے ہیں کہ عموماً لوگ رک کر اس پہ موچی ڈاکٹر کا شفیق ہاتھ لگوا لیتے ہیں تھوڑے سے ٹانک اور پالش سے ایسے جوتوں کی طبیعت بہتر ہوجاتی ہے بلکہ بعض جوتے تو شیشے کی طرح چمک اٹھتے ہیں

موچی ڈاکٹر کے باپ کا کہنا ہے میرے بیٹے نے موچی گری میں سپیشلائزیشن کیا ہے موچی ڈاکٹر نے ایم بی بی ایس صرف پانچ سال میں کیا تھا۔پندرہ برس کی عمر وہ جوتیاں گانٹھنے میں ایم بی بی ایس کر چکا تھا ایک سال کے اندر اس نے اپنا ہاؤس جاب مکمل کیا یعنی گھر میں بیٹھ کر سو جوتیاں مرمت کی یہ جوتیاں اس کا باپ لنڈے سے لایا تھا یہ آئیڈیا سرشار عرف موچی ڈاکٹر کا تھا یہی وہ آئیڈیا ہے جس نے اسے ایک سند یافتہ ڈاکٹر بنایا اور ساتھ ہی امیر کبیر بھی۔موچی ڈاکٹر کا باپ دو ہزار روپے میں جوتے جوتیاں اور کچھ ضرورت کا سامان خرید لایا، دو چار سو روپے کی چیزیں خود موچی ڈاکٹر خرید لایا یہ موچی ڈاکٹر کی نوجوانی اور ہاؤس امتحان تھا ایک سال کی متواتر محنت کے بعد موچی ڈاکٹر نے لنڈے کی جوتیوں کو نئے اور خوبصورت ڈیزائن میں ڈھال دیا تھا کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ پرانی جوتی ہے۔پھر دونوں باپ بیٹے نے مل کر شیخوپورہ میں ایک کھوکھے پر جوتیوں کی دوکان لگائی اور لنڈے کی جوتیاں دو سو روپے کی جوڑی فروخت کر کے کافی پیسہ کمایا۔اس

کیونکہ ان میں سے اکثر ڈاکٹروں نے ایم بی بی ایس صرف پانچ سال کی بجائے آٹھ یا دس سالوں میں اور ایک ہی بار کر لیا تھا، موچی ڈاکٹر کی بد دماغی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے جوتیوں میں ایم بی بی ایس کرنے کے کے علاوہ جوتیوں کی فلاسفی میں بھی پی ایچ ڈی کر رکھی ہے، اِس کے علاوہ موچی ڈاکٹر کے پاس ایم بی او، این بی ایس، ایم سی بی، کے علاوہ ایف سی پی ایس، ایف ائی سی ایس، ایف ار سی ایچ کی فاضل ڈگریاں بھی ہیں، جوتیوں کے نت نئے ڈیزائن سے تنگ آ کر موچی ڈاکٹر نے حال ہی میں ایم سی پی ایس، ڈی سی ای اور ایف سی جی پی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈرماٹالوجی میں بے شمار ڈگریاں حاصل کی ہیں جن میں نارووال سے ڈپ ڈرم اور چیچو کی ملیاں سے ایم ایس سی ڈرم کیا ہے، جوتیوں کو چونکہ گائینی کی زیادہ پرابلم رہتی ہے اس لئے موچی ڈاکٹر نے اندرون شہر سے ڈی آر سی او جی، ایف آر سی او جی، اور ایف اے سی پی آئی بھی کر لیا یہی وجہ ہے کہ موچی ڈاکٹر اکڑا رہتا ہے اس کا کہنا ہے کہ فاضل ڈگریاں لگانی ہوں تو اے بی سی الٹی لکھ کر اپنے نام کے ساتھ جو مرضی لگا لو۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ یہ کیا ہے مگر ڈگریوں کی دھاک ضرور بیٹھے گی۔

اکثر جوتیوں کو نزلہ زکام کھانسی اور معیادی بخار کی شکایات رہتی ہیں اس کے لئے موچی ڈاکٹر نے اپنے فزیشن بیٹے تعینات کر رکھے ہیں، وہ چھوٹے موٹے مرض کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ بعض جوتیوں کو ملیریا اور ٹائیفائڈ کی بیماری ہوتی ہے لیکن موچی ڈاکٹر نے ان بیماریوں کو بھی ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھا رکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ چھوٹی بیماریاں ہیں۔ کئی جوتوں کو شوگر ہوتی ہے وہ ایسے جوتوں کا علاج خود کرتا ہے کیونکہ ذرا سی غلطی سے مرض بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ مریضوں کے لواحقین بددل ہو جائیں چنانچہ وہ ایسے جوتوں کا تسلی بخش علاج کرتا ہے۔ ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ اور سکین کے لئے اس نے ایک مستند ڈاکٹر رکھا ہوا ہے۔ بعض جوتوں اور جوتیوں کی ایکسرے کے بغیر تشخیص ناممکن ہوتی ہے جبکہ بعض شوز کو الٹرا ساؤنڈ کرنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ پہلے ڈاکٹر نبض اور بی پی چیک کرنے کے بعد ایکسرے یا الٹرا ساؤنڈ کرتا ہے اور پھر موچی ڈاکٹر کے حوالے مرض اور مریض کر کے خود آرام کرتا ہے۔ موچی ڈاکٹر مشکل کیس زیادہ خوشی سے پکڑتا ہے۔ خاص طور پر بلڈ پریشر، کینسر، ایڈز اگور پتھریوں کے آپریشن ڈاکٹر کی ہابی ہے۔ وہ جوتیوں کے پتے، گردے، تلی، معدے، جگر اور اپینڈکس کے آپریشن آدھا گھنٹے میں کر کے فارغ ہو جاتا ہے۔ بعض سرجریاں نہایت مشکل ہوتی ہیں، جن میں کبھی کبھی چار چھ گھنٹے یا پورا دن لگ جاتا ہے۔ ایک بار اُس کے پاس ایک ایسی جوتی آئی جو غالباً کسی بھٹنی یا جھنی کی تھی۔ یہ زنانہ جوتی تیرہ نمبر کی تھی جسے چھ نمبر کا بنانا تھا اور اس جوتی میں سے دو چھوٹے چپل بنانے تھے یعنی یہ جوتی حاملہ تھی اور اس کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا کرانے تھے۔ موچی ڈاکٹر نے نہایت مہارت سے یہ کام کیا اور اس کے عیوض صرف آٹھ سو روپے وصول کئے۔ موچی ڈاکٹر اب تک ایسی کئی حاملہ جوتیوں کو مائیں بنا چکا ہے۔ وہ بعض مردانہ جوتوں سے بھی بچے پیدا کر چکا ہے۔ اس کے پاس ہر قسم کی جوتیاں اور جوتے آتے ہیں۔ یہ جوتیاں اور جوتے چونکہ بیش قیمت ہوتے ہیں، لیکن بڑوں کے پاؤں میں نہیں آ رہے ہوتے لہٰذا وہ اُنہیں چھوٹے کروا کے اپنے بچوں کے جوتے بنوا دیتے ہیں۔ اس میں موچی ڈاکٹر کو آرٹ کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ وہ ایسے جوتوں کو آرٹسٹک ٹچ دیتا ہے۔ موچی ڈاکٹر نے کلوننگ کے بھی بے شمار تجربات کئے ہیں اور یہ سارے کے سارے کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اکثر لوگ امراء کے جوتے اور جوتیاں چپکے سے اُٹھا لاتے ہیں۔ یہ جوتے امیر لوگوں نے امریکہ، فرانس اور برطانیہ سے پچاس ہزار، لاکھ، ڈیڑھ لاکھ یا دو لاکھ کے خریدے ہوتے ہیں۔ لوگ کسی نہ کسی طریقے سے اس جوتوں کی تصویریں یا سیمپل یا پھر اصلی جوتے لے آتے ہیں۔ موچی اُنہیں دیکھ کر صرف دو ہزار میں جوتے کی بالکل اصل نقل تیار کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو اصل جوتے کا میٹریل نکال کر وہاں اپنا دیسی میٹریل لگا دیتا ہے اور بالکل ویسا ہی جوتا تیار کر کے داد اور منہ مانگی قیمت وصول کرتا ہے۔

موچی ڈاکٹر کے پاس تپ دق، دمے اور چیچک کے مریض بھی بکثرت آتے ہیں۔ ان کا علاج کافی حد تک ناممکن ہوتا ہے

لیکن موچی ڈاکٹر ان کی بیماری بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے بلکہ ایسیؑ ٹانک، کیپسول، سیرپ اور انجکشن لگاتا ہے جس سے مریض صحت یاب ہوجاتا ہے۔ موچی ڈاکٹر ادویات پر بذاتِ خود تحقیق کرتا ہے۔ وہ اکثر تجربات میں مصروف رہتا ہے۔ اس کی اپنی لیبارٹری ہے جو کلینک کے پچھواڑے میں واقع ہے۔ موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ تپ دق، دمہ، چیچک، کالی کھانسی چنبل، خسرہ اور پیلا یرقان جوتیوں کی ایسی بدترین بیماریاں ہیں جن سے شفا تقریباً ناممکن ہوتی ہے لیکن میرے پاس اس کا موثر علاج ہے۔ جن جوتیوں کا علاج ناممکن ہو، میں اُنہیں نیلا تھوتھا، سنکھیا یا پوٹاشیم سائنیٹ دے دیتا ہوں تاکہ وہ جوتی کسی اور موچی کے پاس نہ پہنچے کیونکہ میں اگر اس کا علاج نہیں کرسکا تو کوئی دوسرا کیسے کرسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری موچی برادری بدنام ہو ؎

سو برسوں سے ہے پیشۂ آباء کفش گری

کچھ ڈاکٹری ہی ذریعۂ عزت نہیں مجھے

موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس قسم کی بیماریاں عموماً اندرونِ شہر، گاؤں، دیہات اور پنڈوں میں رہنے والوں کی جوتیوں کی ہوتی ہے کیونکہ یہاں وافر مقدار میں گٹر، گندے نالے، پرنالے، جوہڑ، کیچڑ، گندگیوں کے ڈھیر اور جابجا ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور تعفن زدہ گلیوں میں ایسی جوتیوں کو غلاظت اور لیدیں لگتی رہتی ہیں، نتیجتاً جوتی کی حالت خستہ، غلیظ اور مدقوق ہوجاتی ہے۔ اگرچہ ان میں جان باقی نہیں رہتی اور انہیں ہاتھ لگانے سے بھی گھن آتی ہے لیکن اگر گاہک اچھی رقم دے تو میں علاج پر راضی ہوجاتا ہوں اور جوتی کی حالت بدل دیتا ہوں۔

موچی ڈاکٹر کی فلاسفی ہے کہ جوتی سے کسی آدمی کے سٹیٹس کا تعین بہت آسان ہوتا ہے۔ منہ کی لیپا پوتی تو ہر کوئی کر کے نکلتا ہے، لباس بھی بیش قیمت پہنتا ہے مگر جب جوتی کی باری آتی ہے تو لوگ بدذوقی اور کنجوسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سرشار عرف موچی ڈاکٹر کے مطابق جوتے یا جوتی سے آدمی کی مالی اور اندرونی حالت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اچھی جوتی یا اچھا جوتا صرف صاحبِ ذوق اور شاہ خرچوں کا وطیرہ ہے۔ قیمتی اور مہنگے جوتے استعمال کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بعض لوگوں کا منہ چار آنے کا ہوتا ہے لیکن وہ جوتا چار ہزار کا پہنتے ہیں، اس سلسلے میں وہ اپنی مثال دیتا ہے، کہتا ہے ''میں مانتا ہوں کہ میری صورت بندر جیسی ہے۔ لوگ مجھے بن مانس کا رشتہ دار سمجھتے ہیں بلکہ بعض منہ پھٹے تو اپنی پھٹی ہوئی جوتی کی طرح منہ پھاڑ کر کہہ دیتے ہیں کہ یار موچی ڈاکٹر، تمھاری شکل بن مانس سے بہت ملتی ہے، چکر کیا ہے؟'' میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ بھلے مانس، ہم سب بن مانس کی اولاد ہیں، کبھی ہم بندر بھی ہوا کرتے تھے مگر پھر انسان بن گئے اور اب انسان سے شیطان بن رہے ہیں، پھر حیوان اور درندے بن جائیں گے۔۔۔ گویا اپنی اصل کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اگر میں بن مانس جیسا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز میری جینز میں ہے۔ یہ جینز میرے جسم کے اندر ہے اور تمھاری جینز تمھارے جسم کے اوپر ہے وہ بھی لنڈا، ارکہ۔۔۔ اصلی جینز تو تم جیسے غریب غرباء افوڈ ہی نہیں کرسکتے۔ بہر حال میں تو اصلی جدی پشتی ہوں۔ ساری اولاد تو ماں باپ پر نہیں جاتی۔ بعض بچے خالو اور پھوپھا پر بھی چلے جاتے ہیں، مثلاً اب تم اپنے آپ کو لے لو، تم اپنے پروفیسر باپ اور ٹیچر ماں سے بالکل نہیں ملتے بلکہ تمھاری شکل اونٹ سے ملتی جلتی ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ چاچا ڈارون کے مطابق ہم بن مانسوں کی اولاد ہیں۔ ہم بن (جنگل) چھوڑ کے درختوں اور بانسوں پر چڑھنا چھوڑ چکے ہیں۔ اب ہم درختوں کے بجائے کمزوروں پر چڑھتے ہیں۔۔۔ اسی لئے ہم بن مانس کے بجائے بھلے مانس کہلانے لگے ہیں۔ میں بھلے سے بن مانس ہی سہی لیکن میری اور اپنی معاشی حالت دیکھو، میں تم سے مہنگا اور قیمتی جوتا پہنتا ہوں۔ میرے جوتے کی قیمت چار پانچ ہزار سے کم نہیں ہوتی، میں تم جیسے غریب نقادوں کی طرح سو دو سو کا جوتا نہیں پہنتا۔ دو جوتے خرید لئے اور اس میں زندگی کا ایک عشرہ نکال لیا۔ غریب نقادو۔۔۔ ساری زندگی سچ بول کر، لوگوں پر تنقید کر کے تمھیں ملتا ہی کیا ہے سوائے صلواتوں کے۔۔۔ تم ساری زندی پڑھنے اور ایم فل، پی ایچ ڈی کرنے میں سرکھپاتے ہو، باقی کی بچی کھچی جوانی تم بچے پڑھانے اور مضامین لکھنے لکھانے میں گنوادیتے

وہ بہت سست الوجود سا بندہ ہے۔ ہر اہم کام میں متعدد دقیقے فروگزاشت کرتا ہے اور بالعموم دو دقیقوں کی فروگزاشت کے درمیان نیل تا کاشغر کا فاصلہ رکھتا ہے۔ **ڈاکٹر عزیز فیصل**

ہو خوشامدیں کر کر کے کتابیں چھپواتے ہو اور اکثر پبلشر تمھیں چھاپا خانے کے چکر لگوا لگوا کر دونوں جوڑی جوتے گھسوا دیتے ہیں۔ سفارشیں کر کے کالم چھپواتے ہو اور تمھارے تنقیدی مقالے اوّل تو کوئی شائع کرنا پسند نہیں کرتا، اگر خوشامدوں اور چاپلوسیوں کے باعث چھپ جائیں تو لوگوں سے گالیاں، ٹماٹر، انڈے اور پھٹے ہوئے جوتے سر پر پڑتے ہیں۔ اِتنی محنت سے جان مار کر کئی دِنوں میں مضمون لکھتے ہو، اس کے ہزار پانچ سو روپے رو رو کر ملتے ہیں جس سے تم پرچون والے، دودھ والے، نائی قصائی کا ادھار نمٹا کر اپنی خفت مٹاتے ہو۔۔۔ یہ ہے تمھاری اوقات او غریب مفلوک الحال لکھنے والے۔۔۔ تم دنیا کو سدھارنے اور معاشی و معاشرتی انقلاب لانے کی بات کرتے ہو۔۔۔ ذرا اپنی حالت دیکھو، ادھڑی ہوئی قمیض، رفو کیا ہوا پاجامہ اور پھٹا ہوا جوتا۔۔۔ افلاطون نے ٹھیک کہا تھا کہ ریاست سے شاعروں، ادیبوں، نقادوں کو نکال باہر کرنا چاہیئے۔ تم لوگ قلم اُٹھانے کے سوا صرف ٹشو پیپر اُٹھا سکتے ہو۔۔۔ باتیں تم آسمان ڈھانے کی کرتے ہو مگر نہ تم خنجر پکڑ سکتے ہو نہ تلوار۔۔۔ نہ ریوالور نہ گن نہ توپ۔۔۔ ارے تم زمین کا وہ بوجھ ہو جو دو اینٹیں سر پر اُٹھا کر نہیں لے جا سکتے۔ تمھارے نحیف و نزار بدن میں جان نہیں ہے مگر تمھاری زبان، دماغ اور قلم میزائل کی طرح چلتا ہے۔ ساری دنیا نے ترقی کی، نائی، قصائی، حلوائی، ٹیچر، ڈاکٹر انجینئر، وکیل، پولیس سبھی نے مال کمایا لیکن ایک تم ہو ادیب شاعر نقاد صحافی۔۔۔ چند کو چھوڑ کر سارے کے سارے معاشرے پر ناقابلِ برداشت بوجھ ہو۔ مالی امداد کے لئے بھکاریوں کی طرح گورنر، وزیرِ اعلیٰ، وزیرِ اعظم اور صدر کو درخواستیں لکھتے رہتے ہو اور وہ ردی میں بیچ کر قومی خزانہ بھرتے رہتے ہیں۔۔۔ ارے تم جیسے منفعل لوگ مر کیوں نہیں جاتے۔ تم تو قریب المرگ ہوتے تو اللہ میاں کو بھی خط لکھ کر بھیج دیتے ہو کہ چند سال مزید ایکسٹینشن چاہیئے، ابھی اس فانی دنیا سے جانے کو جی نہیں چاہتا ۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں ابدی پھر نہیں آتی

موچی ڈاکٹر کے اس لیکچر کا عظیم نقاد کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ اپنا پھٹا ہوا جوتا وہیں چھوڑ کر سیدھا مینارِ پاکستان پر پہنچا۔ خیال تھا کہ مینار پر چڑھ کر خودکشی کر لے لیکن مینار پر گارڈ نے چڑھنے نہ دیا اور مینار پر چڑھنے کے لئے پچاس روپے کا ٹکٹ خریدنے کو کہا۔ نقاد بیچارے کی جیب میں صرف پانچ روپے اور دو چونیاں بچی پڑی تھیں۔ اس نے اپنا وہ اکلوتا قیمتی قلم جو اُسے انعام میں ملا تھا، گارڈ کے حوالے کیا۔ اوپر چڑھ کر نقاد نے مرنے کا قصد کیا۔ وہ مینارِ پاکستان پر چڑھا تو اسے دنیا بہت مصروف دکھائی دی۔ اس نے سوچا کہ مرنے سے پہلے دنیا پر ایک انتقادانہ نظر ڈال لینی چاہیئے کیونکہ پھر یہ دنیا دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا چنانچہ وہ دنیا کا تنقیدی انداز میں جائزہ لینے لگا۔ یہ دسمبر کا کڑکڑاتا جاڑا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ صبح کو نقاد کی سکڑی سمٹی لاش ستون سے چپٹی ہوئی ملی۔ نقاد کی باخبر تصویر چھپی اور حکومت نے بیچارے غریب نقاد کے لواحقین کو دس لاکھ روپے دیئے۔ وزیرِ اعلیٰ نے نمازِ جنازہ پر ایک نہایت عمدہ تقریر کی جس میں ادیب نقاد کی بے پناہ خدمات اور ماورائی صلاحیتوں کو سراہا۔ گورنر نے کہا کہ ایسے عظیم ادیب اور نقاد صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مرحوم ارسطو اور افلاطون کے پائے کا دانشور تھا۔ میں مرحوم کے لواحقین کو پندرہ لاکھ روپے کا چیک بطور نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ وزیرِ اعظم نے بھی اپنے ٹیلیگرام میں مرحوم نقاد کی عالیشان روایات کو سراہتے ہوئے کہا کہ میں مرحوم کا ادنیٰ سا پرستار ہوں۔ مجھے یہ جان کر دلی صدمہ ہوا کہ مرحوم نقاد کسمپرسی کی حالت میں فوت ہوئے۔ ان کی وجیہہ شخصیت سے میں ہمیشہ متاثر رہا لیکن مرحوم کی آخری تصویر دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کیونکہ تصویر میں نری ہڈیاں تھیں۔ غالباً نقاد مرحوم اپنی جوانی کی تصویریں شائع کروانے کے شوقین تھے لیکن معلوم ہوا کہ تنگدستی نے ان کا یہ حال کیا ہے۔ ازالے کے طور پر حکومت کی طرف سے مرحوم کو پچیس لاکھ روپے کا چیک لفِ ہذا ہے۔

موچی ڈاکٹر نے اگلے دن اخبار پڑھا تو سر پیٹ لیا کیونکہ نقاد کو جیتے جی تو کبھی یکمشت پچیس ہزار بھی نہ ملے تھے مگر مرنے کے بعد وہ پچاس ہزار کا مالک ہو گیا ۔

تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ
تو یہ شہرت ہزار نعمت ہے

اس واقعے سے موچی ڈاکٹر کا احساس ہو گیا کہ وہ چاہے تو دنیا کو اپنے اشاروں پر نچا سکتا ہے۔ وہ صرف جوتیوں کی ہی نفسیات نہیں سمجھتا بلکہ انسانوں کی سائکالوجی بھی خوب سمجھتا ہے۔ اپنی اس صلاحیت کو بڑھانے کے لئے موچی ڈاکٹر نے جوتوں اور ان کے مالکوں پر زیادہ تحقیق شروع کر دی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک ریسرچ لیبارٹری قائم کر دی۔ اب اس کے چاروں بیٹے اور تینوں بیٹیاں بھی اس کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ اس نے اپنی ایک بیٹی کو ٹیلیفون آپریٹر اور ریسپشنسٹ مقرر کیا۔ دوسری بیٹی کو سیکرٹری نامزد کیا اور تیسری بیٹی کو ٹیلرنگ کا کام سونپا۔ موچی ڈاکٹر کے دو بیٹے فزیشن کے طور پر پہلے ہی فرائض انجام دے رہے تھے۔ جونہی اس کے دو چھوٹے بیٹوں نے ایل ایل بی اور ایم ایس سی پاس کیا، موچی ڈاکٹر نے وکیل بیٹے کو کلینک کا قانونی مشیر بنا دیا اور کمپیوٹر انجینئر بیٹے کو کلینک میں اہم ذمہ داریاں سونپ دیں۔ کمپیوٹر انجینئر کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ مرمت کے لئے آنے والی تمام جوتیوں کا ریکارڈ کمپیوٹر میں فیڈ کرے۔ جوتی کا رنگ، سائز، مالیت اور مالک کا اندراج کرے۔ جوتی پر آنے والا خرچہ اور مرمت فیس بھی ریکارڈ کرے۔ موچی ڈاکٹر کا کلینک اب تین گز زمین سے تین مرلہ کلینک کا روپ دھار چکا تھا لہٰذا موچی ڈاکٹر نے اس میں تین شعبے قائم کئے۔ پہلا شعبہ آؤٹ ڈور اور دوسرا ان ڈور اور تیسرا سرجری پلانٹ تھا۔ اِن ڈور میں معمولی درجے کی جوتیوں کا چیک اپ کیا جانے لگا۔ اِن ڈور میں صرف وہ جوتے اور جوتیاں آتیں جو مالیت کے لحاظ سے ہیوی ہوتیں یا جن کا ایمرجنسی کیس ہوتا۔ سرجری ڈیپارٹمنٹ میں بڑے لوگوں کے جوتوں کی سرجری ہوتی۔

جوتی کی مرمت کرانے والے پہلے آپریٹر سے رابطہ کرتے پھر ریسیپشن پر آتے۔ جوتی کی اور اپنی حیثیت کا تعین کراتے، ریسپشنسٹ فیصلہ کرتی کہ جوتی کو کس شعبے میں بھیجنا ہے۔ اس فیصلے کے بعد سیکرٹری کا کام شروع ہو جاتا۔ وہ دیکھتی کہ جوتی والے کو باپ کے پاس بھیجنا ہے یا بھائیوں کے۔ جوتی کے چیک اپ اور فیس طے ہونے کے بعد جوتی اور جوتی والا کمپیوٹر انجینئر کی کسٹڈی میں چلا جاتا۔ اگر کوئی زیادہ بل آنے، جوتا خراب ہونے یا جوتی گم ہونے کا الزام لگاتا یا موچی ڈاکٹر اور اس کے کلینک کے خلاف شرانگیز باتیں، پمفلٹ یا تقریریں کرتا تو قانونی چارہ جوئی کے لئے وکیل کھڑا ہو جاتا۔ موچی ڈاکٹر کی آمدن کافی زیادہ تھی، اس لئے اسے ایک عدد خزانچی کی ضرورت تھی، اس نے اپنی بیوی کو اکاؤنٹنٹ بنا کر رکھ لیا۔ باپ گھر میں فالتو بیٹھا روٹیاں توڑا کرتا یا حقہ گڑگڑاتا رہتا، چنانچہ موچی ڈاکٹر نے باپ کو جوتیوں کے کوپن پر بٹھا دیا۔ موچی ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ میرے گھر میں کوئی بیروزگار نہیں۔ گھر کا ہر آدمی اونچے عہدے پر متمکن ہے۔ آج کل موچی ڈاکٹر اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ ڈیفینس میں رہتا ہے۔ اس کے چاروں لڑکے اور باپ کینٹ میں رہتے ہیں۔

سرشار عرف موچی ڈاکٹر کے خیالات بہت بلند ہیں۔ کبھی کبھی سمجھ نہیں آتی کہ اس کے خیالات زیادہ بلند ہیں یا حالات؟ اس کی ترقی کی رفتار اس کے خیالات سے زیادہ تیز ہے۔ وہ دنیا کا واحد موچی ہے جسے اتنی خدمات اور کامیابیوں کے باوجود کوئی ایوارڈ یا ٹرافی نہیں ملی۔ جو ایک دو ٹرافیاں اور کپ اُس نے حاصل کئے ہیں وہ سفارشوں اور ڈالروں کے بل بوتے پر۔۔۔ ایک ایوارڈ اسے سائنسِ باہمی اکیڈمی نے دیا کیونکہ اسٹاک ایکسچینج میں لوٹ مار کے عالمی ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔ اسے صرف گھر میں سراہا جاتا ہے۔ اس کی بیٹیاں اسے جوتا ایسوسی ایشن کا صدر ہی نہیں، دیوتا بھی مانتی ہیں۔ البتہ اس کی بیوی دو جوتے پاؤں میں اور ایک ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح مزاجی خدا ٹریک پر رہتا ہے۔

موچی ڈاکٹر کی ہر تھیوری آئن سٹائن کی تھیوری سے جا ملتی ہے بلکہ کبھی کبھار تو وہ ماسٹر آف تھیوری سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے

باوجود وہ تھیوری سے زیادہ پریکٹیکل کا قائل ہے۔اس کی ایک تھیوری عالمگیر حیثیت کی حامل ہے۔۔۔کہتا ہے کہ جوتے سے آدمی پہچانا جاتا ہے۔اس کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ کھسیانا آدمی جوتی نوچے۔موچی ڈاکٹر کی فلاسفی آف شوز کے مطابق جوتوں اور جوتیوں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔یہ قسمیں بھی جھوٹی اور سچی قسموں جیسی ہوتی ہیں۔وہ کہتا ہے کہ جوتی چمڑے کی ہو یا کپڑے کی، جوتا ریکسین کا ہو، وولن کا، ربڑ کا ہو یا پلاسٹک کا، اگر میڈ اِن پاکستان یا چائنا ہے تو اس کی مرمت بیکار ہے کیونکہ جتنی رقم جوتے گھانٹھنے میں اُٹھے گی، بہتر ہے کہ اُتنی رقم میں بندہ نیا جوتا خرید لے کیونکہ پاکستانی اور چینی برانڈ کا جوتا ہو یا جوتی، محبوب کی طرح بے وفا ہوتا ہے اور رقیب کی طرح دغا دیتا ہے۔موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بھارت، بنگلہ دیش، چین، نیپال، سری لنکا اور پاکستان میں انتہائی ہلکی کوالٹی کی جوتی تیار کی جاتی ہے۔یہ جوتی اپنے رسک پر ہی پہنی جاسکتی ہے کیونکہ اکثر فنکشنز میں یہ ٹوٹ کر بے عزتی کا اہتمام کر دیتی ہے۔اگلے کو پتہ چل جاتا ہے کہ دیسی ساخت کی ہے۔موچی ڈاکٹر کے خیال میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان سمیت تمام یورپ میں جوتی اِتنی مضبوط اور پائیدار اور خوشنما تیار کی جاتی ہے کہ آدمی آدھی زندگی ایک جوتی کے سہارے کاٹ سکتا ہے۔موچی ڈاکٹر کا خیال ہے کہ جنوبی ایشیاء میں جوتی کی ناپائیداری اور بے وقعتی کی وجہ صرف عورتیں ہیں جو ہاتھ چھوڑ ہونے کے علاوہ جوتی چھوڑ بھی ہوتی ہیں۔یہاں نکھٹو، کام چور، ہڈحرام مرد وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، اس لئے اُنہیں چالو کرنے کے لئے مائیں، بہنیں اور بیویاں جوتی کا استعمال بے دریغ کرتی ہیں لیکن ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں جو بہت تابعدار، ذمہ دار اور ہونہار مردوں کو مزید فرمانبردار بنانے کے لئے جوتم پیزار کرتی ہیں۔ایشائی عورتوں کو جوتیاں مارنے کی عادت بچپن سے ہوتی ہے۔وہ جوتیاں چلانے، پہننے اور مارنے میں اس قدر ماہر ہیں کہ اگر اُنہیں سرحد پر بٹھا دیا جائے تو دشمن جوتیاں کھا کر بھی بے مزا نہ ہوں۔موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ محض عورتوں کی کارگزاری اور برہمی سے بچنے کے لئے بہت ہلکی قسم کی جوتیاں پلاننگ کے تحت بنائی جاتی ہیں۔آخر جوتیاں بنانے والے نے بھی تو گھر جانا ہوتا ہے۔

موچی ڈاکٹر کی تھیوری کے مطابق ربڑ اور پلاسٹک کی جوتیاں موچی برادری کے لئے محض وقت کا ضیاع ہے۔اُنہیں جتنا بھی اور جہاں سے بھی جوڑا جائے، دو چار دن بعد پھر ٹوٹ جاتی ہیں۔یہ جوتیاں محبوب کے دلوں کا ماڈل ہوتی ہیں۔چمڑے کی جوتی گھانٹھنے میں توانائی زیادہ صرف ہوتی ہے لیکن پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ریکسین، وولن اور کپڑے کی جوتیاں نہایت نرم اور موم کی ناک کی طرح ہوتی ہیں۔ان کی مرمت میں مزا آتا ہے۔ موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جوتی دیکھ کر جوتی کے مالک کی حیثیت، سرگرمیاں اور اوقات معلوم ہو جاتی ہے۔سب سے آرام دہ جوتی شوبز والوں کی ہوتی ہے۔سیاستدانوں کی جوتی اور جوتے بھی اچھی حالت میں ہوتے ہیں لیکن جب الیکشن کا زمانہ ہو تو ان کے جوتے گھانٹھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔کبھی ان پر کیچڑ لتھڑی ہوتی ہے کبھی جوتے غلاظت سے بھرے ہوتے ہیں۔بعض اوقات جوتوں سے مٹی کے علاوہ جھاڑ جھنکار چپکا ہوتا ہے اور جوتوں سے ایسی سرانڈ آرہی ہوتی ہے کہ موچی کو متلی اور قے کی شکایت ہونے لگتی ہے۔موچی ڈاکٹر بتاتا ہے کہ وکیلوں، صحافیوں اور پولیس والوں کے جوتے بھی بہت گندے ہوتے ہیں۔وکیلوں کے جوتوں میں کیلوں کو زیادہ ٹھونکا گیا ہوتا ہے۔وکیلوں کے جوتے مرمت کے دوران بہت شور مچاتے ہیں اور ان کے اندر سے چرچراہٹ کی آواز آتی ہے۔صحافیوں کے جوتے کثرتِ استعمال سے گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ان کے جوتے شہر کی ہر سڑک، گلی، فٹ پاتھ کی خاک پھانکے ہوتے ہیں۔جب جوتے کو جھاڑو، مٹی برآمد ہوتی ہے۔صحافیوں کو چاہیئے کہ وہ مٹیالے جوتے استعمال کریں۔موچی ڈاکٹر پولیس والوں کے جوتے مرمت کرنے سے پہلے مغلظات ضرور ادا کرتا ہے، پولیس والوں کے جوتے سخت چمڑے کے ہوتے ہیں اگرچہ انہیں صاف حالت میں پالش کر کے رکھا ہوتا ہے لیکن ہاتھ میں پکڑ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اندر کتنی بساند اور بدبو ہے، نیز جوتے کو پہننے سے زیادہ چھترول میں استعمال کیا

گیا ہے ،غرضیکہ موچی ڈاکٹر ہر قسم اور ہر سائز کے لوگوں کے جوتوں پہ عبور رکھتا ہے ،اگر اس کے سامنے جوتا رکھ دیا جائے تو وہ بتا سکتا ہے کہ کس علاقے کا اور کس قبیل کا جوتا ہے ،پہننے والا کس نسل اور ٹائپ کا آدمی ہے ،اس کے ذرائع آمدن کیا ہیں ،وہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ؟؟؟

موچی ڈاکٹر کے مطابق پہلے لڑکے والے لڑکی کا رشتہ لینے کے لئے جوتے گھسا کرتے تھے مگر اب لڑکی والے اپنے کئی درجن جوڑے جوتے گھستے ہیں تب مشکل سے کوئی گھسا پٹا ،سوکھا سڑا ،غریب دکھیارا ،استعمال شدہ لڑکا ہاتھ آتا ہے ۔موچی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ لڑکی والوں کو چاہیئے کہ وہ جوتوں کی جگہ کھڑاویں استعمال کریں تاکہ ہر مہینے نئے جوتے خریدنے کے جنجال سے بچے رہیں ،وہ کہتا ہے کہ میری تین بیٹیاں پچھلے کئی تین سالوں سے جوان ہیں مگر کوئی لڑکا شادی نہیں کرتا ،ہم نے اس مقصد کے لئے کھڑاویں استعمال کرنا شروع کر دیں ہیں ،موچی ڈاکٹر کہتا ہے کہ کچھ یہی حال بیروزگاروں کا ہے ،ان کا جوتا غربت وافلاس کا مارا ہوتا ہے وہ نوکری کے لئے اتنی جگہ درخواستیں دیتے اور اتنے زیادہ انٹرویوز دینے جاتے ہیں کہ ان کے جوتوں کے ساتھ ان کے پاؤں بھی گھس جاتے ہیں تب جا کے انہیں کہیں کلرک کی نوکری نصیب ہوتی ہے ،موچی ڈاکٹر نے اپنے خاص گاہکوں کے لئے سپیشل ڈسکاؤنٹ اور سیل لگا رکھی ہے ،ان میں سفید پوشوں اور بیروزگاروں کی بڑی تعداد سروس کلینک کی لائف ٹائم ممبر ہے ۔وہ سیاستدانوں کو الیکشن سیزم میں خاص رعایت دیتا ہے اسی طرح شوبز کے اداکاروں کو جوتیاں سیل میں گانٹھ کے دیتا ہے ۔

موچی ڈاکٹر کی گوناگوں مصروفیات نے اسے اپنی سوانح حیات کا پارٹ ٹو لکھنے کا ٹائم نہیں دیا ہے وہ کوئی عام کیس نہیں لیتا ،صرف خاص کیسوں کو اپائینٹمنٹ کے تحت چیک کرتا ہے اس کا ارادہ اپنے کلینک کو ہسپتال بنانے کا ہے جس میں وہ کئی ڈیپارٹمنٹ قائم کرے گا ۔موبائل اور ایمبولینس سروس وہ گذشتہ سال چالو کر چکا ہے ،اس کا خیال ہے کہ آپریشن تھیٹر جدید بنیادوں پر بنایا جائے موچی ڈاکٹر ایک شوز انسٹیٹیوٹ قائم کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے اس نے ہسپتال کے تمام وارڈوں کے نام اپنے بچوں پر رکھنے کا فیصلہ کیا ہے ۔وہ ایک شوز آڈیٹوریم بھی بنوا رہا ہے جو اس کی بیوی کے نام سے منسوب ہوگا ۔اس کے علاوہ ایک وارڈ جوتیاں کھانے والوں کے لئے مخصوص ہوگا ۔۔۔وہ مرد جو گھروں میں جوتیاں کھاتے ہیں اور جن سیاستدانوں ،لیڈروں کو مجمع میں جوتیاں اور انڈے پڑتے ہیں ۔نیز جن زناکاروں اور منافقوں کو جوتیاں مارنے کے علاوہ جوتیوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں ۔۔۔ان کا اور اُن کی جوتیوں کا تسلی بخش علاج کیا جائے گا۔

موچی ڈاکٹر کی خواہش ہے کہ وہ اپنی جائز آمدنی سے بیوی بچوں کے ناز نخرے اٹھائے گا ،سرشار عرف موچی ڈاکٹر ایک بہت بڑا موجد ،خالق اور فلاسفر ہے ،وہ اپنی متعلق کہتا ہے کہ لوگوں کو خوامخواہ مغالطہ ہے کہ میں کوئی جینئیس یا جینٹلمین ہوں جو اتنی دولت کا مالک ہوں ۔میں ذہین نہیں بلکہ چالاک آدمی ہوں ،آدمی کو نبض شناش سے زیادہ موقع شناس ابن الوقت اور چڑھتے سورج کا پجاری ہونا چاہیئے ۔۔۔اسی میں دین ودنیا کی بھلائی ہے لوگوں کو اصلی سکندر اعظم یاد بھی نہیں جس نے تینتیس برس کی عمر میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دنیا فتح کی لیکن سارا شہر مجھے جانتا ہے کہ سرشار عرف موچی ڈاکٹر کہاں رہتا ہے ۔۔۔کیونکہ میں موچی اعظم ہوں اور آج میرے نام کا ڈنکا بجتا ہے کیونکہ میں کہنے کو تو سرشار ہوں لیکن درحقیقت ہوشیار ہوں ۔

لاہور سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر صبیح خان ہمہ جہت شخصیت کی مالکہ ہیں ۔یہ صحافی ،استاد ،ادیبہ ،شاعرہ ،نقاد ،محقق ،دانشور ،اینکر ،ڈرامہ رائٹر ،مزاح نگار ،کالم نویس ،تجزیہ کار اور بہت کچھ ہیں ۔بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں بیشتر طنز و مزاح پر مبنی ہیں جبکہ بے شمار ڈرامے بھی لکھ چکی ہیں ۔پی ایچ ڈی کے لئے اُن کا مقالہ ''اُردو تنقید کا اصلی چہرہ'' علم و عرفان پبلشرز سے شائع ہو کر اسی سطح کے طلباء و طالبات کے لئے حوالے کا ذریعہ بن چکا ہے ۔ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ ہمارے اور آپ کے مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بھی گاہے بگاہے لکھتی رہتی ہیں ۔

ہنسئیے اور خوب ہنسئیے

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

آج کے حالات نے حضرت انسان کی مسکراہٹ پر نہ صرف یہ کہ شب خون مارا ہے، ہر شخص اُداس اور پریشان ہے، بعض اوقات ان باتوں پر تشویش ہوتی ہے جن پر نہیں ہونی چاہیے، مثال کے طور پر وقتِ مقررہ پر بجلی نہیں گئی، مسجد سے جوتا چوری نہیں ہوا، رکشے والے نے کرایہ کم لیا، وغیرہ وغیرہ۔ اِسی طرح کی بے شمار باتیں ہیں۔ اس کے علاوہ حرماں نصیبی کے قصے الگ، واقعاتِ زمانہ اور ذاتی غموں نے ہر شخص کو گیلی لکڑی کی طرح سلگنے پر مجبور کردیا ہے، لیکن اِنہیں لوگوں میں ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو اپنی تقریر و تحریر سے روتے ہوؤں کو ہنسا دیتے ہیں، ہنسانے کے بہت سے طریقے ہیں، انھی طریقوں میں ایک طریقہ مزاحیہ تحریریں ہیں، ان تحریروں کا وجود اسی وقت سے ہوا ہے جب سے شعر و سخن وجود میں آیا۔

مغربی مفکرین نے مختلف طرزِ فکر سے ہنسی یعنی مزاح کی تعریف کی ہے، یورپ میں سب سے پہلے افلاطون نے ہنسی کی تعریف کرنے کی کوشش کی، اس کے خیال میں ''طربیئے میں روح، غم اور مسرّت کے ملے جلے جذبات سے دوچار ہوتی ہے۔'' افلاطون کے بعد ارسطو کی بھی کچھ ایسی قسم کی رائے تھی۔ سترہویں صدی کے مشہور فلسفی ہابز کے خیال کے مطابق ''ہنسی اس جذبۂ افتخار یا احساسِ برتری کے سوا کچھ نہیں جو دوسروں کی کمزوریوں یا اپنی کوتاہیوں کے احساس کے تقابل وجود میں آتا ہے، مغربی مفکرین'' کانٹ، شوپن ہار، برگساں کے ہنسی کے حوالے سے مختلف نظریات ہیں۔

مشرقی حکماء نے ہنسی کی تعریف علیحدہ علیحدہ مضمون میں کی ہے، علی بن ربان الطبری ہنسی کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ

''ہنسی طبعی خون میں جوش و ہیجان پیدا ہونے سے آتی ہے، کوئی چیز اپنی طرف مائل کر کے حیران اور متاثر کرے اور اگر قوتِ فکر سے کام نہ لیا جائے تو ہنسی غالب آجائے گی۔''

کچھ فلاسفر ہنسی کا سبب خارج میں تلاش کرتے ہیں، کچھ ہنسی کو داخلی اور نفسیاتی توضیح کرتے ہیں۔

مزاح کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ مزاح کے اندر تدریجی ارتقاء کو اس طوفانی ندی سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو پتھروں اور

چٹانوں سے سر پٹختی، شور مچاتی، جھاگ اُڑاتی، آخرش ایک وسیع کشادہ اور پُر سکون دریا کی صورت اختیار کرے اور پھر سمندر میں مل کر ابدیت اختیار کر لے۔ شاعری کے اعتبار سے دیکھیں تو جعفر زٹلی اُردو کا پہلا ظریف شاعر ہے اور اُردو کا پہلا ہزل گو بھی جعفر زٹلی ہے۔ ان کے بعد، سودا اور سودا کے ساتھ (میر تقی میر کا تذکرہ بھی لازم و ملزوم ہوتا ہے) انشاء اور مصحفی اور نظیر اکبر آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری بھی سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مزاحیہ شاعری میں غالب کا نام بھی نمایاں ہے، اُردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے حوالے سے غالب کے نام کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ فرماتے ہیں:

- وفا کیسی کہاں کا عشق، جب سَر پھوڑنا ٹھہرا
  تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
- دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
  یاں آ پڑی یہ شرم کے تکرار کیا کریں
- پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
  آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
- ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
  دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
- ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
  دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اقبال کی طنزیہ شاعری میں ظرافت و سنجیدگی کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

- ہم تو سمجھے تھے لائے گی فراغت تعلیم
  کیا خبر تھی چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
- گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
  لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ
- یہ بیان عصرِ حاضر کے بنے ہیں مدرسے میں
  نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ

جعفر زٹلی سے لے کر موجودہ دور تک طنز و مزاح کا جائزہ لیا جائے تو ایک واضح ارتقاء کا احساس ہوتا ہے، ہجو اور ہزل سے نکل کر طنز میں مہذب انداز نے جگہ بنالی ہے۔ اُس دور میں شاد عارفی اور راجہ مہدی علی خان کی نظمیں قابلِ ذکر ہیں۔ راجہ مہدی خان کی
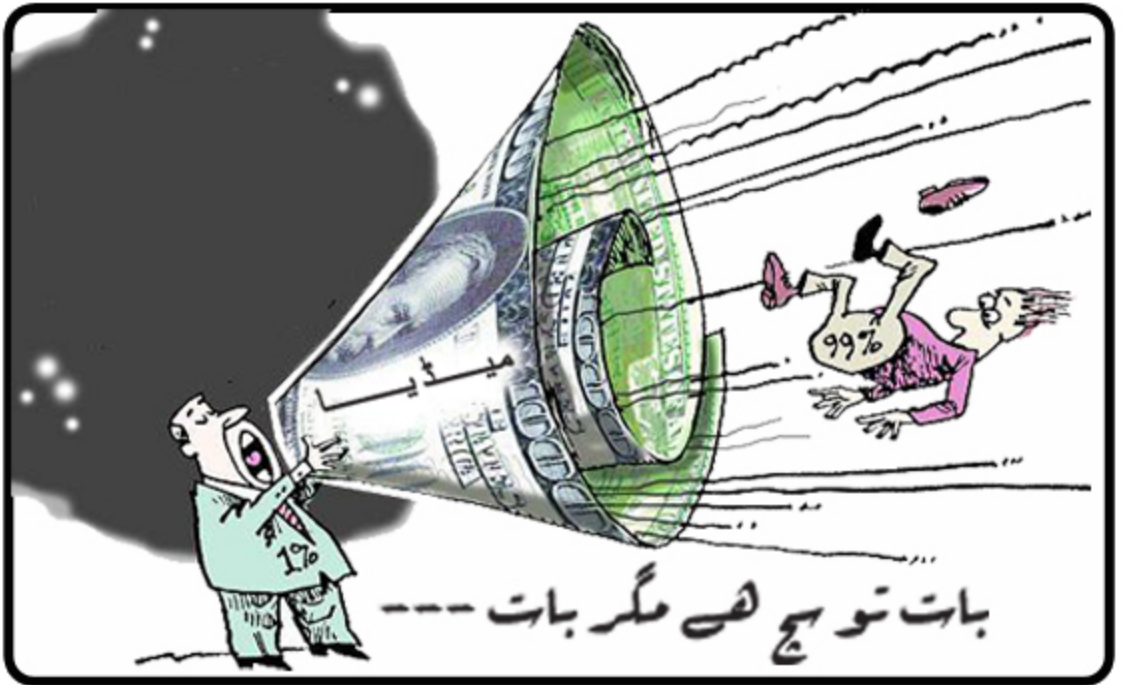
ایک نظم چور کی دعا کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ کس قدر خوبصورت انداز میں طنز کیا گیا ہے ۔

اے خالقِ ارض و سماء وقتِ دعا ہے
بندے پہ تیرے آج عجب وقت پڑا ہے
پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تُو نے بچایا
دائم رہا مجھ پر ترے الطاف کا سایہ
جب نام تیرا لے کے کوئی نقب لگائی
ہر کام کی تدبیر مجھے تُو نے بھائی
سچ تو یہ کتوں کو سُلا رکھتا ہے تُو ہی
مرے لیے دروازہ کھلا رکھتا ہے تُو ہی
انصاف کے پنجے سے مجھے تُو نے چھڑایا
اور دامِ حوالات میں اوروں کو پھنسایا

شفیق الرحمٰن، مشتاق یوسفی، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی سے لے کر انور احمد علوی تک اور مرزا عاصی اختر، مرزا عابد عباس، ابوالفرح ہمایوں، عزیز جبران انصاری اور بہت سارے مزاح نگاروں نے نثر و نظم میں طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں، لوگ اس آتش بازی سے محظوظ ہوئے ہیں، دل کھول کر اتنا ہنسے ہیں کہ آنکھوں سے پانی جاری ہوگیا، اگر اس پانی کو جمع کر لیا جاتا تو ایک ندی ضرور بن جاتی، روتے ہوؤں پر اس پانی کے چھینٹے مارنا بے حد مفید ثابت ہوتا۔

حال ہی میں ''بزمِ مزاح'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، ترتیب و تدوین انور احمد علوی کی ہے، انور احمد علوی سہ ماہی ''مزاح پلس'' نکالتے ہیں، خود بہت اچھے مزاح نگار اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ''بزمِ مزاح'' میں ۲۱ مزاح نگاروں کے مضامین شامل ہیں۔ ایک مضمون اس طرح یوں ہوا کہ ہم اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہوگئے ہیں۔ ''تعزیت کا جوڑا'' راقم الحروف کا بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں قابلِ قدر مصنفین کی تحریریں شامل ہیں، کئی مضامین پڑھنے کے بعد جو ہمیں سب سے زیادہ مضمون پسند آیا وہ تھا مصنفہ رفعت ہمایوں کا ''ساڈا سارا کھر چہ تہاڈے ہی نال ہے'' نمونے کے طور پر چند سطور۔

''ہمارے موصوف بے انتہا سادگی پسند ہیں، ہمیشہ سفید کُرتا، پاجامہ، ہوائی چپل اور دوسروں کی بیویاں پسند کرتے ہیں، مگر اس دن وہ اپنے روایتی لباس یعنی لنگی اور بنیان میں ملبوس تھے، بنیان بھی ایسی جھرجھری کہ آپ دور ہی سے موصوف کی پسلیاں گن سکتے تھے، ادھر ہمارا خلیہ کہ آخر موصوف کو ہم میں نظر کیا آیا، کپڑوں کے سائز کی ہم نے کبھی پرواہ نہیں کی، بس اتنا لمبا چوڑا ہو، جس میں ہم آسانی سے گھس جائیں، ایک تو ویسے بھی ہماری شکل بنگالی نوکرانیوں جیسی ہے، اس پر سے کام، لوگ ہمیں نوکرانی سمجھتے ہیں، آپ کی بیوی نہیں۔ موصوف ہنس پڑے، مگر ہمارا غصہ دور نہیں ہوا۔''

اِس کتاب میں جناب کلیم چغتائی کی دو غزلیں بھی شامل ہیں، ایک غزل کے چند اشعار ۔

افسرِ سرکار ہونا چاہیے
ٹھاٹ سے دفتر میں سونا چاہیے
دل مرا فی الفور واپس کیجیے
آپ کو شاید کھلونا چاہیے
آپ کا مضموں فکاہی ہے مگر
اس کے ہر فقرے پہ رونا چاہیے

بزمِ مزاح دلشاد انجم، شجاع الدین غوری، غفور اسد، مرزا عاصی اختر، مرزا عابد عباس اور دوسرے قلمکاروں کی تحریروں سے مرصع ہے۔ مرزا عابد عباس کی غزل کے کچھ اشعار ۔

موبائل کے طلسم سے دوچار ہوگئے
اس کی جفاؤں کے بھی پرستار ہوگئے
سمجھے تھے دس ہزار میں عزت خرید لی
مقروض ہو کے اور بھی ہم خوار ہوگئے

مرزا عابد عباس کی حال ہی میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین و خاکوں پر مشتمل کتاب شائع ہوئی ہے، عنوان ہے ''شریرِ خامہ'' اسی کتاب سے ایک پیراگراف نذرِ قارئین:

''بچو! تمہیں تو معلوم ہوگا کہ کھیل کے سامان کی سب سے بڑی صنعت سیالکوٹ میں ہے، لیکن اس شہر کی وجہ شہرت اقبال کی جائے پیدائش ہونا چاہیے، علامہ اقبال نے شاعری میں جو صنعتیں استعمال کی ہیں وہ کسی صنعت کار کی بھی سمجھ میں نہیں آسکتیں، تم کیا سمجھو گے۔ بچو! علامہ اقبال نے فرمایا تھا: ''خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر'' لیکن آج کل تو بھائی لوگوں نے ''خودی'' کو اچھے داموں فروخت کر کے گلشنِ اقبال میں شاندار کوٹھیاں تعمیر کروالی ہیں، ضمیر جعفری نے فرمایا تھا ؎

کبھی اک سال میں ہم مجلس اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں قوال کرتے ہیں

''ماں کا دعا ساس کا بددعا'' غفور اسد کی تحریر بھی صرف یہی نہیں کہ مسکرانے پر مجبور کرتی ہے بلکہ بے ساختہ قہقہہ بھی ٹھنڈے پانی کی طرح اُبل پڑتا ہے۔

''یکا یک اس نے ٹیکسی روک دی اور حیرت سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا: ''آپ تو مسلمان لگتا ہے صیب!''

ہاں، ہاں ہم جلدی سے بولے، ٹی وی چینل پر کام ضرور کرتے ہیں، چہرے پر داڑھی نہیں ہے، جھوٹ بھی خوب بولتے ہیں، مگر ہیں مسلمان۔ سچ مچ آپ مسلمان ہو؟ ہاں بھائی! خیر سگالی کے طور پر انڈین فلمیں دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلتی ہے اور صبح کی نماز رہ جاتی ہے، باقی نمازیں کام کی زیادتی کی وجہ سے چھوٹ جاتی ہیں، لیکن بھائی! عید کی نماز پابندی سے پڑھتے ہیں اور آج کا مسلمان ایسا ہی ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن (کناڈا) کی ایک تحریر "بڑھاپے کی بڑھکوں سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جسے عہدِ پیری کہا جاتا ہے جس میں مرد وزن کی کل کائنات ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتی ہے۔ مرد اپنی بوڑھی بیوی کو ''ہیما مالنی، کترینہ اور کرشما کپور'' جبکہ بیوی اپنے بوڑھے ''خاوند بابے'' کو ''شاہ رخ'' خیال کرتی ہے حالانکہ اس عمر میں انسان کسی رخ سے بھی سیدھا نہیں ہوتا۔ دونوں کی بتیسی (مصنوعی دانت) اور عینک کا نمبر ایک جیسا ہو جاتا ہے۔ جس کو جو چاہیے مستعار لے اور اپنا گزارہ کر لے۔ مثلاً بابا جی کو بھوک لگی ہو تو کھانے کے لئے بتیسی ادھار پکڑی کھانا کھایا بتیسی گرم پانی میں سٹرلائز کی اور ''باجی'' کے منہ میں۔ اماں کو تلاوت فرمانی ہوئی تو بابے کی عینک پکڑی، دھاگے والے فریم کو ناک کی سلوٹوں پہ ایڈجسٹ کیا، بعد از تلاوت عینک بڑے پیار سے بابے کی ناک پہ چسپاں۔ گویا انسان اگر بوڑھا نہ

ہوتا تو چشموں اور دانتوں کے کام کا مکمل مندا ہوتا۔ اکثر میری کلاس کے بچے شرارتاً سوال کرتے ہیں کہ سر بڑھاپے کی آمد کا پتہ کیسے چلتا ہے۔تو میں ہمیشہ یہ جواب دیتا ہوں کہ جب منہ میں دانت گرنے لگیں اور عینک کا نمبر بڑھنے لگے تو سمجھ جاؤ کہ بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔یا پھر اولاد اور اعضائے جسمانی ایک ساتھ جواب دینے لگ جائیں ،بیوی اور یادداشت کا ساتھ کم ہونے لگے،کھانے کا ذائقہ اور بدصورت عورتوں کا ساتھ حسین لگنے لگے ،حد یہ کہ جب بچے آپ کو نانا ،دادا جبکہ حسین لڑکیاں انکل کہہ کر پکارنا شروع کردیں تو کسی قسم کے تردد سے کام نہ لیتے ہوئے چپ چاپ اپنے بڑھاپے کو ایسے ہی تسلیم کرلیں جیسے بوقتِ نکاح دلہن سے پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ فلاں بن فلاں قبول ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ماسوا اس کے کہ ہاں ''سب چلے گا۔''

ویسے بڑھاپا مغرب میں اتنا برا خیال نہیں کیا جاتا جتنا کہ مشرقی لوگوں نے بنا دیا ہے۔مغربی بڈھے جتنا بڑھاپے کو ''انجوائے'' کرتے ہیں اتنا ہم مشرقی جوانی میں بھی شائد نہ کرتے ہوں،مغرب میں بوڑھوں کو عمر کے ڈھلتے ہی اولڈ ہوم بھیج دیا جاتا ہے تاکہ ان کی کیئر ہوسکے جبکہ ہمارے ہاں بوڑھوں کو گھر میں ہی رکھا جاتا ہے تاکہ جوانوں کے ''طعنے معنوں'' کی زد میں رہ کر ان کے کتھارسس کا باعث بن سکیں۔طعنے ذرا ملاحظہ فرمائیں:

*بابے کی چارپائی جانوروں والے کمرے میں لگا دیں

*بابا ہر بات میں ٹانگ نہ اڑایا کر،حالانکہ بابا اپنی ٹانگوں پہ کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔

* بڑھاپے میں کوئی فعلِ جوانی سرزد ہو جائے تو ''چٹے چاٹے(سفید بالوں) کا خیال کر،چاٹا سفید ہو گیا عقل نہ آئی،بوڑھی گھوڑی لال لگام جیسے القابات سے نوازا جاتا ہے،مشرق میں تو بڑھاپے کو توبہ واستغفار کی عمر خیال کیا جاتا ہے کہ بابا جی تسبیح مصلحہ لے لو اور اللہ اللہ کرو،حالانکہ مغرب میں جو بوڑھے ایامِ جوانی میں جس عورت سے عیاشی کرتے رہے بڑھاپے میں اسی عورت سے شادی کو آئیڈیل عمر اور جوڑی سمجھتے ہیں،اسی لئے بڑھاپا مشرق میں مرض اور بوجھ جبکہ مغرب میں ''انجوائے'' کرنے کی اصل عمر اور وقت خیال کیا جاتا ہے۔اس میں قصور نہ مشرقی بوڑھوں کا ہے اور نہ مغربی بلکہ اس عورت کا جس کے پیچھے ہم بوڑھے ہوتے ہیں۔

عورتیں بوڑھی تو ہوتی ہیں مگر ان کے ''لچھن'' اکثر جوان رہتے ہیں۔یہ ان کی عمر کا کرشمہ ہے کہ جس کی وجہ سے بوڑھے بھی جوان رہنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔بڑھاپے کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ ''بے ضرر'' ہوگئے ہیں۔آپ اپنے سوا کسی کو بھی اب نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ہاں مگر اس قول نے بہت سے بوڑھوں کا نقصان ضرور کیا ہے کہ ''مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھے نہیں ہوتے'' یہ ایک نہیں بہت سے بوڑھوں کا خیال ہے،گھوڑوں کا نہیں۔آپ نے اولاد کی تربیت پر مکمل دھیان دیا ہو،وراثت میں کثیر مال و دولت آپ نے چھوڑنی ہو،یا پھر کسی نے تگڑی انشورنس پالیسی کروا رکھی ہو،پھر تو آپ کی آخری سانس تک ''بلے بلے'' وگرنہ ''کلے کلے'' جو بھی ہو بوڑھوں کا دنیا پر ایک احسان ضرور ہے کہ اگر بوڑھے ہونے کا رواج نہ ہوتا تو دنیا کب کی بوڑھی ہو چکی ہوتی۔''سوہتھ رسا سرے تے گنڈھ'' بڑھاپا ہوتا بہرحال باوفا ہے۔ایک بار جب آجاتا ہے تو پھر مرتے دم تک ساتھ نبھاتا ہے۔

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔اب تک اِنہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو اِن کا جواب ہی نہیں۔حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر سی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

مارچ، اپریل ۲۰۱۹ء